

بابائے عربی

حسن الاعظمی

مہتاب پیامی

ناشر علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

مبارک ہے ہمیں یاں کی فضا، یاں کے گلی کوچے
سو ہم اِس شہر کو شہرِ مبارک پور کہتے ہیں

مبارک پور کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت جس نے عرب دنیا میں
علامہ اقبالؔ کو متعارف کرایا

بابائے عربی
حسن الاعظمی

تحقیق و تالیف
مہتاب پیامی

ناشر
علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

یہ کتاب نگر پالیکا مبارک پور کی ویب سائٹ پر بھی پڑھی جا سکتی ہے
www.nppmubarakpur.com

نام کتاب	بابائے عربی حسن الاعظمی
مولف	مہتاب پیامی
صفحات	۸۸
اشاعت	صفر ۱۴۳۵ھ/دسمبر ۲۰۱۳ء
تعداد	۵۰۰
قیمت	۶۰ روپے
ناشر	علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، مبارک پور

ملنے کے پتے

(۱) نگر پالیکا کمپیوٹر سینٹر، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)
(۲) منہاج بک ڈپو، انصاری مارکیٹ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)
(۳) پیامی کمپیوٹر گرافکس، چھوٹی ارجنٹی، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)
(۴) مکتبہ الفہیم، مئو
(۵) نوری کتاب گھر، جامعہ اشرفیہ کے سامنے، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

CONTACT

عامر فہیم (انچارج نگر پالیکا کمپیوٹر سینٹر، مبارک پور) 9936453914
مہتاب پیامی: 9235647041
amirfaheem786@gmail.com
payamee@gmail.com

فہرست

باباے عربی حسن الاعظمی

انتساب

مبارک پور کی
ان تمام گمشدہ شخصیات کے نام
جنھوں نے دنیا کو بہتر بنانے کے لیے
خود کو فنا کر دیا

مہتاب پیامی
۱۵/ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
۲۰/ نومبر ۲۰۱۳ء

تاثرات...

ایک گمنام مجاہدِ اردو

از: ڈاکٹر شمیم احمد، چیرمین نگر پالیکا پریشد، مبارک پور
وسرپرست علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی مبارکپور

سید راجہ مبارک شاہ مانک پوری کے نام سے منسوب مبارکپور قصبہ پارچہ بافی کی صنعت کے لیے پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔ یہ اپنی صنعت و حرفت کے علاوہ علوم و فنون کا بھی اہم مرکز رہا ہے۔ مبارکپور میں قدآور علما، ادبا و شعرا پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی خدمات سے مبارکپور کو دنیا بھر میں متعارف کرایا، ایسے ہی قابلِ فخر لوگوں میں حسن الاعظمی کا بھی شمار ہوتا ہے جو مبارکپور میں پیدا ہوئے اور یہیں بنیادی تعلیم حاصل کی، پھر حصولِ علم کے لیے مصر کا سفر کیا۔ حسن الاعظمی نے سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں انھیں سَو کتابوں کی اشاعت پر پاکستان میں بابائے عربی کا خطاب دیا گیا انھوں نے جامعہ ازہر میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے کے ساتھ ہی عالمِ اسلام کے اس عظیم ادارہ میں شعبۂ اردو کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا نیز علامہ اقبال کو عرب دنیا سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مبارک باد کے لائق ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس گمنام شخصیت کو عوام کے سامنے لانے کا عزم کیا اور بالخصوص عزیز گرامی مہتاب پیامی جنھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

مبارک پور نگر پالیکا گذشتہ دس بارہ سالوں سے جہاں تعمیراتی ترقی اور دوسری خدمات میں ایک اہم مقام رکھتی ہے وہیں اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے بھی اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ یہ واحد ایسی نگر پالیکا ہے جو نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ادبی پروگرام کا انعقاد کرتی ہے یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم اس کے لیے عزیز گرامی مہتاب پیامی اور اپنی سوسائٹی کے ذمہ داران جنھوں نے اس سلسلہ میں قدم بڑھایا ہے، بالخصوص عامر فہیم، مولانا انعام الرحمان اور قاری شفیق اعظمی وغیرہ کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ ان افراد نے حسن الاعظمی کی حیات وخدمات کو منظرِ عام پر لانے کی سعیِ مشکور کی۔ اس طرح ایک گم نام مجاہدِ اردو سے ہم اور آپ آشنا ہوئے۔

(ڈاکٹر شمیم احمد)
چیئرمین نگر پالیکا پریشد مبارکپور

تاثرات...

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

از: احمد جاوید، ایڈیٹوریل انچارج روزنامہ "انقلاب" پٹنہ

آپ ایک ایسے شخص کا تصور کیجیے جس نے ہندوستان کے ایک بہت ہی چھوٹے مگر انتہائی متمول فرقہ اور یوپی کے ایک اہم صنعتی قصبہ کے ایک خوش حال تاجر خاندان میں آنکھیں کھولی ہوں۔ بقدرِ ضرورت اردو اور فارسی سیکھنے کے بعد عربی سیکھنے کی طرف متوجہ ہوا ہو اور اسی عمل میں ایک دن قرآن کریم کی ایک آیت نے اس نوجوان کو ایسا بے چین کر دیا ہو کہ وہ اپنے گھربار، خاندان، رشتے ناطے اور فرقے سب کو تج کر سوئے حرم چل پڑا ہو اور پھر اس نے 'بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل' کا وہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ہو کہ ایک دنیا چونک اٹھی ہو، شہر کے خوگر کو وسعتِ صحرا، محوِ تحیّرات کو شوقِ تماشا اور گم گشتۂ لن ترانی کو ذوقِ تقاضا سے آشنا کرنے، قلبوں کو تڑپانے، روحوں کو گرمانے اور وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکانے کی تگ ودو میں اپنی ساری زندگی لگادی ہو۔ یہ تصویر ہرگز کسی اور کی نہیں، علامہ حسن الاعظمی کی بنے گی جنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے اتحاد، امت محمدیہ کے اِحیا اور اس کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن ہم نے ان کو بھلانے میں دیر نہیں لگائی۔ علامہ اعظمیؔ نے کسی فرقے کی بساط پر یہ تگ ودَو کی ہوتی یا کسی مسلک کی آبیاری میں اپنا خون پسینہ ایک کیا ہوتا تو بھی شاید اتنی آسانی سے نہ بھلائے جاتے لیکن وہ تو سرشارِ مئے محبت واخوت تھے، دلوں کو جوڑنے اور عالم اسلام میں اتحاد واخوت کی روح پھونکنے کی جدوجہد کرتے رہے اور ہم گرفتارِ رسوم وقیود ایسے کہ جن کو وہ متحد کرنا چاہتے تھے ان میں یہ صدائیں اس وقت بھی اجنبی تھیں آج بھی اجنبی ہیں۔

اب شاید کسی کو بھی یاد نہیں کہ یہ علامہ حسن الاعظمی ہی تھے جنہوں نے مصر اور دیگر ممالک

کے علماو مفکرین اور ادیبوں کے ساتھ مل کر قاہرہ میں 'جماعۃ الاخوۃ الاسلامیۃ' کی بنیاد رکھی، جس کی کوکھ سے آگے چل کر 'موتمر العالم الاسلامی' اور پھر 'اتحاد العالم الاسلامی' کا جنم ہوا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران عالمِ اسلام کے سب سے بڑے علمی و ثقافتی مرکز قاہرہ سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت رسائل و جرائد کے لیے علامہ اقبالؔ کے اسلامی تصورات و پیغامات سے لبریز اشعار کا ترجمہ عربی زبان میں حسن الاعظمیؔ نے ہی کیا جس کو جامعہ الازہر کے ممتاز شاعر استاد صاوی علی شعلانؔ نے منظوم کیا اور یہ وہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے شاعرِ مشرق کے کلام کا منثور و منظوم ترجمہ کرکے عرب دنیا سے اقبالؔ اور ان کے فکر و فلسفہ کو متعارف کرایا تھا اور ۱۹۳۵ء سے یہ کلام 'جماعۃ الاخوۃ الاسلامیۃ' کے اجلاس میں دلچسپی سے سنے جانے لگے تھے۔ بغور دیکھیں تو وہ عرب و عجم بالخصوص مصر و ہند میں ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے جہاں اہلِ عرب کو برِ عظیم ہند کے تاریخی و سیاسی حالات سے باخبر کیا وہیں دنیاے عرب اور مصر کے حالات پر اردو میں گرانقدر کتابیں لکھیں۔ ان کی مرتب کردہ عربی اردو لغت 'المعجم الاعظم' ۵ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی اور پھر اردو عربی لغت بھی شائع ہوئی جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ گویا برِ عظیم میں عربی زبان و ادب کے فروغ میں بھی ان کا غیر معمولی کردار ہے اور ملتِ اسلامیہ پر ان کے گوناگوں احسانات ہیں۔

قابلِ مبارکباد ہیں عزیز گرامی مہتاب پیامی، عامر فہیم اور ان کے رفقا و معاونین جنھوں نے مبارک پور کی خاک سے اٹھے ملت کے اس عظیم فرزند کی یادوں کو تازہ کرنے اور ان کی شخصیت و خدمات سے نئی نسلوں کو روشناس کرانے کا بیڑہ اٹھایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

احمد جاوید
خادم 'انقلاب' پٹنہ
جمعرات، ۵/ دسمبر ۲۰۱۳ء

تاثرات...

عظمتِ رفتہ

از: ڈاکٹر شباب الدین، صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل پی جی کالج، اعظم گڑھ

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں اٹھتا ہے وہ نیرِ اعظم ہوتا ہے

(اقبالؔ سہیل)

مبارک پور، اعظم گڑھ ضلع کا ایک مردم خیز قصبہ ہے، اس کی خاک سے علم وفضل، تحقیق و تصنیف، ادب وشعر اور تاریخ و تہذیب کی ایسی ایسی ہستیاں منصۂ شہود پر آئیں جن کے فیض سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورا عالمِ اسلام مستفیض ہوا، مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اور مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے۔ ان کے علاوہ ادب وشعر کے میدان میں عطاؔ، شفاؔ، رہبرؔ منشی سہدیو رام کیفؔ وغیرہ کے نام عزت سے لیے جاتے ہیں۔ ''تذکرہ علماے مبارک پور'' اور ''تذکرہ علماے اعظم گڑھ'' میں جستہ جستہ مبارک پوری علما کے حالات اس کے شاہدِ عدل ہیں۔

اس علمی گہوارہ کا ایک فرزندِ جلیل حسنؔ الاعظمی بھی ہے جو بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں آسمانِ علم و ادب پر طلوع ہوا، ابتدائی تعلیم مبارک پور ہی میں حاصل کی مگر طلبِ علم کے شوق نے اس کو سورت، حیدر آباد، لاہور اور کراچی کے ساتھ ساتھ مصر کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا، فراغت کے بعد قاہرہ یونیورسٹی میں پروفیسری کے منصب پر فائز ہوئے، ان کی علمی تصنیفی وتعلیمی خدمات اور اداراتی سرگرمیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے جن کی تفصیلات زیرِ نظر کتاب میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کا سب سے حیرت انگیز

کارنامہ مصر میں اردو زبان و ادب کے متعلق ان کی خدمات اور عالمِ عرب بالخصوص مصر میں علامہ اقبال کو متعارف کرانا ہے۔ مبارک پور کے اس فرزند نے اردو کی نشو ونما اور ترقی کے لیے بڑی قابلِ فخر خدمت انجام دیں، عربوں کے لیے آسان اردو نصاب تیار کیا اور قاہرہ یونیورسٹی میں انھیں کی کوششوں سے باقاعدہ شعبۂ اردو قائم ہوا اور آج بھی یہ شعبہ پوری آب و تاب کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ اس کے موجودہ صدر پروفیسر جلال الحفناوی صاحب نے علامہ شبلی کی سیرت النبی ﷺ، الفاروق، علم الکلام، الکلام اور المامون وغیرہ کا عربی ترجمہ محض اردو زبان کے مصر میں فروغ کے مقصد سے کیا، ہماری دعوت پر وہ دعوت سیمینار میں شبلی کالج تشریف لا چکے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے پیچھے اگر یہ کہا جائے کہ مولانا حسن الاعظمی کی کوششوں کا دخل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے عرب علما عطاء الرحیم، محمد رزق المصری اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام وغیرہ سے بڑے گہرے مراسم تھے۔

اس کتاب کے لائق مصنف مہتاب پیامی (ماہ نامہ) شہرِ ادب، مبارک پور کے مدیر رہے ہیں، اور اس سے قبل ان کی دو کتابیں "بت، بت گری اور بت پرستی" اور "قرآن کے سائنسی پہلو" اہلِ علم سے دادِ تحقیق و صدائے آفریں حاصل کر چکی ہیں، ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ انھوں نے ہمارے کالج کے شعبۂ اردو سے کسبِ فیض بھی کیا ہے۔ اس تازہ پیش کش کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے علم و تحقیق اور تاریخ کے گلشن سے ایسے پھول کو تلاش کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے جس کی عطر افشانی پر ناقدردانیِ زمانہ نے پہرا لگا رکھا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ ان کی اس کوشش کو قبولِ عام کی سند عطا کرے۔ (آمین)

(ڈاکٹر) شباب الدین
صدر شعبۂ اردو
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ
۳۰؍ نومبر ۲۰۱۳ء

تاثرات...

حسن الاعظمی کی معنوی حیثیت

از: محبِ مکرم مولانا انعام الرحمٰن انصاری مبارک پور

پروفیسر حسن الاعظمی کو دارِ فانی سے رخصت ہوئے تقریباً ڈیڑھ دہائی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ ان کے متعلقین، احباب اور تلامذہ نیز اہل صحافت بالخصوص ہندوستان کی اردو اور عربی دنیائے ادب نے ان کی علمی و ادبی خدمات پر خامہ فرسائی کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، سوائے علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی مبارکپور کے، جس نے عرصۂ دراز کے بعد ''یومِ حسن الاعظمی'' پر ۲۵/ دسمبر ۲۰۱۲ء کو ایک مذاکرے کا انعقاد کیا اور حسن الاعظمی کی ہمہ گیر شخصیت کو عوام الناس کے ساتھ ساتھ علمی حلقوں میں روشناس کرانے کی سعیِ بلیغ کی۔ قابل مبارک باد ہیں سوسائٹی کے احباب و فعال اراکین جنھوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور مبارک پور کے اس علمی تابندہ ستارے پر ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا اور اس گوہرِ نایاب کو متعارف کرانے کی کوشش کی۔

موجودہ دور میں حسن الاعظمی سے عدم واقفیت کی بنیادی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ حسن الاعظمی کے مشن کو ان کی زندگی میں ہی ادبا وشعرا، نقادوں اور دانش وروں نے فراموش کر دیا تھا۔ اربابِ حل و عقد اچھی طرح واقف ہیں کہ حسن الاعظمی کی تخلیقات کا شاندار سلسلہ ہندوستان سے شروع ہو کر مصر اور بلادِ عرب میں جاری ہوا۔ حالاں کہ عرب دنیا میں اقبالؔ کی فکری جہانگیری اور ادبی جہاں داری کو متعارف کرانے میں ان کا زبردست کارنامہ ہے، اسی کے ساتھ اردو زبان و ادب کو عرب ملکوں میں فروغ دینے کا سہرا انہیں کے سر جاتا ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، وہ ہجرت کر کے پاکستان

چلے گئے اور وہیں سے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا جسم دستوری طور پر یقیناً پاکستان ہو گیا تھا لیکن فکری اور ادبی دنیا میں وہ سرحدوں میں کبھی قید نہیں رہے۔

مذاکرہ کے بعد بالخصوص نئی نسل میں حسن الاعظمیؒ کے کارناموں سے واقفیت کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کا سلسلہ دراز ہونے لگا اور حسن الاعظمیؒ کی معنوی حیثیت نمایاں ہونے لگی۔

الحمد للہ! مبارک پور کی فکری و فنی ترجمانی کی ذمہ داری نہایت دلچسپی کے ساتھ مہتابؔ پیامی صاحب نے پوری کرنے کا عزم کیا ہے۔ حسن الاعظمیؒ کی تخلیقات اور ان کے مشن کا تعارف اور ان کے تئیں عربی اردو ادبا اور ناقدین کے نظریات کو انھوں نے بحسن و خوبی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے حسن الاعظمیؒ کی علمی و ادبی قدر و قیمت اور تنظیمی صلاحیت نیز تخلیقی رجحان کا پتہ چلتا ہے، اور یہ منصوبہ بندی کسی مفاد کے تحت نہیں بلکہ خالصۃً حسن الاعظمیؒ کے فکری اور ذہنی کینوس کو عصری معنویت عطا کرنے کی نیت سے ہے۔ انشاء اللہ پیامیؔ صاحب کی یہ کوشش حسن الاعظمیؒ کو متعارف کرانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

انعام الرحمان انصاری مبارکپوری

تاثرات...

عرب ممالک میں حسن الاعظمیؒ کا اہم کردار

از: عامر فہیم انصاری
سکریٹری علامہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، مبارک پور

ہم اکثر سنا کرتے تھے کہ مبارک پور کی ایک عظیم شخصیت علامہ حسن الاعظمیؒ کی بھی تھی جن کا ایک اہم کارنامہ قاہرہ یونیورسٹی، مصر میں شعبۂ اردو کا قیام ہے اور یہ کہ ان کی سو سے زائد کتابیں ہیں۔ ان کی شخصیت سے واقفیت کی کوشش تو بہت کی مگر اس عظیم ہستی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ کر سکے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ایک روز 'اقبالؔ اکادمی آف پاکستان' (جو حکومت پاکستان کا ادارہ ہے) کی ویب سائٹ دیکھ رہے تھے کہ حسن الاعظمیؒ کا ذکر علامہ اقبالؔ کے حوالے سے ملا۔ یہ علامہ اقبالؔ کو عرب ممالک سے روشناس کرانے میں حسن الاعظمیؒ کے اہم کردار کا ذکر تھا۔ ہم نے ای میل کے ذریعہ 'اقبال اکادمی پاکستان' سے رجوع کیا کہ وہ حسن الاعظمیؒ کے متعلق جتنی بھی معلومات ہمیں فراہم کرا سکیں کرا دیں کیوں کہ اس عظیم شخصیت کا تعلق ہمارے شہر مبارکپور سے ہے۔ ۱۸/ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ایک خط (بذریعہ ای میل) 'اقبال اکادمی آف پاکستان' کے ناظم محمد سہیل عمرؔ کا ملا، جس میں کچھ کتابوں کے نام اور سر عبد القادرؔ کا لکھا ہوا ان کا ایک تعارف بھی تھا۔

علامہ حسن الاعظمیؒ کے اس مختصر سے تعارف اور ان کی حیات و خدمات کی اس ایک جھلک نے میرے اندر حیرت و مسرت کے غیر معمولی جذبات بھر دیے۔ جس شخص نے ملت اسلامیہ کی سرخروئی اور عالم اسلام میں اخوت واتحاد کے فروغ کے لیے اپنی ساری زندگی صَرف کر دی، اسے ہم نے کتنی آسانی سے بھلا دیا! یہی وہ احساس تھا جس کے زیر اثر علامہ حسن الاعظمیؒ کے یوم پیدائش ۲۵ / دسمبر ۲۰۱۲ء کو نگر پالیکا ہال میں ایک کنونشن کا

اہتمام کیا گیا تھا جس میں مبارک پور کی اہم شخصیات نے حصہ لیا اور ہماری اس پہل پر خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی اس بات کی تاکید بھی کی کہ حسن الاعظمیؒ کی خدمات کو مکمل طور پر اجاگر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے تاکہ ہم ان کی شخصیت اور خدمات سے اہلِ مبارک پور کے ساتھ ہی پورے ہندوستان کو متعارف کرا سکیں۔ استاذِ گرامی محترم ماسٹر مہتابؔ پیامی صاحب نے کتاب تصنیف کرکے ہماری اس تحریک کو آگے بڑھانے کی سعیِ مشکور کی ہے۔ ہم پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو کام محترم مہتابؔ پیامی صاحب نے انجام دیا ہے اسے اس خوش سلوبی کے ساتھ کوئی اور انجام نہیں دے سکتا تھا۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ کوشش رنگ لائے گی اور لوگ حسن الاعظمیؒ جیسی عظیم شخصیت سے روشناس ہو سکیں گے۔

عامر فہیم
سکریٹری
علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی
مبارکپور

اظہارِ تشکر

(۱)-ڈاکٹر شمیم احمد صاحب چیرمین نگر پالیکا پریشد مبارک پور۔ جن کی سرپرستی میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ (۲) ڈاکٹر شباب الدین صاحب صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ۔ جنھوں نے اپنے گراں قدر کلماتِ طیبات سے کتاب کو زینت بخشی۔ (۳) عالیجناب احمد جاوید صاحب ایڈیٹوریل انچارج روز نامہ انقلاب، پٹنہ ایڈیشن، جنھوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور کتاب کے لیے تقریظی کلمات رقم فرمائے۔ (۴) مولانا انعام الرحمٰن مبارک پوری صاحب۔ جنھوں نے ہماری معاونت میں اپنا غیر مطبوعہ مضمون ہمیں فراہم کیا۔ (۵) عامر فہیم صاحب انچارج نگر پالیکا کمپیوٹر سینٹر مبارک پور۔ جن کی تحریک پر اس کام کا آغاز ہوا۔ (٦)-مولانا فواز رحمانی صاحب (جے این یو، نئی دہلی)۔ جنھوں نے حسن اعظمی کے بعض ماخذ کی رہ نمائی کی۔ (۷)-کوثر مبارک پوری صاحب۔ جنھوں نے ایک خصوصی ملاقات میں ہمیں حسن الاعظمی صاحب کے متعلق کافی جانکاری دی۔ (۸)-ملا جعفر ابن فیاض حسین صاحب۔ جنھوں نے ہمیں کافی جانکاری بہم پہنچائی۔ (۹)- مولانا محمد طفیل احمد مصباحی سب ایڈیٹر ماہ نامہ اشرفیہ، جنھوں نے بعض عربی عبارات کا ترجمہ و تلخیص کی۔ (۱۰)-مولانا منہال رضا خیر آبادی۔ جنھوں نے فارسی عبارات کا ترجمہ و تلخیص کی۔ (۱۱)- مولانا اختر حسین فیضی مصباحی انچارج امام احمد رضا لائبریری جامعہ اشرفیہ مبارک پور، جنھوں نے حسن الاعظمی کی بعض کتابیں فراہم کیں۔ (۱۲)- ماسٹر امیر حیدر صاحب مبارک پوری، لکچرر مولانا آزاد انٹر کالج انجان شہید اعظم گڑھ۔ جنھوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ (۱۳)-جمیل احمد علیگ ابن عبد اللہ چیرمین صاحب مرحوم۔ جنھوں نے اکثر ماخذ تک رہ نمائی کی۔

ہم ان تمام حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مہتاب پیامی

مبارک پور-ایک مردم خیز شہر

راجہ مبارک علی شاہ کے نام سے منسوب مبارک پور کبھی قاسم آباد کے نام سے جانا جاتا تھا یہ نام اسے مسلم زمیں دار خاتون قسیمہ بی بی کے نام پر دیا گیا تھا۔ پھر جب کڑامانک پور الہ آباد کے راجہ مبارک علی شاہ معروف بہ راجہ مبارک شاہ یہاں تشریف لائے (تقریباً ۶۰۰/ برس قبل)اس کے بعد سے اس مسلم بستی کا نام مبارک پور پڑ گیا۔

مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور و معروف قصبہ ہے، ریشمی ساڑیوں اور الجامعۃ الاشرفیہ نے مبارک پور کو عالمی سطح پر شہرت دلائی ہے۔ یہ قصبہ شہر اعظم گڑھ سے ۱۶ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۵۱۰۸۰/ تھی جو ۲۰۱۱ء میں بڑھ کر تقریباً ۵۰۰۰۰۷ ہو چکی ہے۔ علم و ادب شعر و سخن، اخلاق و کردار، ایثار و قربانی اور اپنی دست کاری کے باعث یہاں کے لوگوں نے ہندوستان بھر میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔

جغرافیائی حد بندی کی بات کریں تو یہ قصبہ ۲۶ ڈگری شمالی گلوب اور ۸۳ ڈگری مشرقی گلوب پر واقع ہے۔ پورا علاقہ میدانی ہے جو دریائے ٹونس کی سیلابی مٹی سے بنا ہے دریائے ٹونس مبارک پور سے ۳ کلومیٹر شمال میں بہتا ہے۔ دریائے ٹونس کے دونوں کناروں پر بہت سے گاؤں بھی آباد ہیں جو سیلاب کے زمانوں میں پانی سے بھر جاتے ہیں۔ ٹونس کا سیلابی ریلا مبارک پور کے شمال میں واقع موضع سریاں، نوادہ، رسول پور، پاہیں، حسین آباد وغیرہ کو تو غرق کرتا ہی ہے، بڑھتا ہوا مبارک پور میں بھی چلا آتا ہے اور شمال میں واقع محلے بالخصوص محلہ کٹرہ کا نصف حصہ بھی سیلاب کی نذر ہو جاتا ہے۔

مبارک پور کے مقامی باشندوں کا رہن سہن بالکل سادہ ہے، تصنع اور بناوٹ جیسی چیزوں سے مبرّا یہاں کے افراد پرانی قدروں پر یقین رکھتے ہیں اور نئی تہذیب کی بوقلمونیوں سے کافی حد تک بچے ہوئے ہیں۔ نوجوان طبقہ جدیدیت کے رنگ میں ظاہر طور پر ڈوبا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اس کے دل میں بھی اپنی تہذیب سے محبت کی رمق کسی حد تک آج بھی برقرار ہے۔

تاریخی طور پر یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ قصبہ کب آباد ہوا۔ تاریخی دستاویزات سے یہ شواہد ملے ہیں کہ چودہویں صدی عیسوی میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں یہاں ۴۰۰۰، بنکروں کے خاندان آباد تھے، جن کا مخصوص پیشہ پارچہ بافی تھا۔ اس وقت یہ علاقہ قاسم آباد کے نام

سے معروف تھا۔ قاسم آباد سے پہلے اس گاؤں کا کیا نام تھا حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا، البتہ گجھرڑایا "گجی ہارا" کے حوالے سے اس مقام کا ذکر ہندو مذہب کی مختلف مذہبی کتابوں میں ملتا ہے۔ غالبًا مبارکپور کی ابتدا گجھرڑا ہی سے ہوئی۔

پھر جب راجہ مبارک علی شاہ کی آمد ہوئی تو ان کے ساتھ بنکروں کے متعدّد خاندان بھی یہاں آئے اور راجہ مبارک شاہ کی ایما پر یہیں آباد ہو گئے۔ راجہ مبارک شاہ راجہ ہی نہیں بلکہ ایک صوفی بزرگ بھی تھے۔ مبارک پور میں واقع جامع مسجد راجہ مبارک شاہ جو آپ ہی کے نام سے منسوب ہے، روایت ہے کہ آپ اس میں نمازِ جمعہ کی امامت فرمایا کرتے تھے۔

سترہویں صدی عیسوی میں مشہور سیاح ابن بطوطہ جب ہندوستان کے دار الحکومت دہلی آیا تو اس نے وہاں کے بازاروں میں بکتے ہوئے کچھ کپڑے دیکھے۔ ایسے شان دار کپڑے اس نے اب تک نہیں دیکھے تھے، چناں چہ اس نے جب دکان داروں سے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ قاسم آباد (مبارک پور) کے بنے ہوئے کپڑے ہیں اور کافی گراں قیمت ہیں۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں ان کپڑوں کا باقاعدہ تذکرہ کیا ہے۔

ریشمی ساڑیوں کی بنائی یہاں کی مخصوص صنعت ہے، جیسا کہ ہم نے تحریر کیا، یہ صنعت یہاں پرانے وقتوں سے پھل پھول رہی تھی، لیکن سرکاری عدم توجہی، کچے مال کے امپورٹ اور تیار مصنوعات کے ایکسپورٹ پر پابندی کے چلتے اِن دنوں یہ صنعت اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ یہاں کے ۹۵ فی صد لوگ اسی صنعت پر منحصر تھے، لیکن اِن دنوں بے روزگاری کا یہ عالم ہے کہ قصبے کے پچاس فیصد سے زائد نوجوان تلاش معاش کے سلسلے میں یہاں سے ہجرت کر چکے ہیں۔

۹۰ کی دہائی کے بعد کساد بازاری اور صنعتی زوال نے یہاں کے لوگوں کو حصولِ تعلیم کی طرف راغب کیا ہے۔ اس سے پہلے ایک عام مزاج یہ تھا کہ تعلیم حاصل کر کے ہمارے بچے کچھ کر نہیں سکتے، آبائی کاروبار سے منسلک رہیں گے تو آگے معاشی طور پر خود مختار ہو سکتے ہیں۔ یہ خام خیالی سرکاری پالیسیوں کے چلتے دیوانے کی بڑ ثابت ہوئی اور وہ لڑکے جنھوں نے تعلیم کی طرف توجہ کی تھی، سماجی اور معاشی طور پر قابلِ ذکر پوزیشن میں آ گئے جب کہ جنھوں نے تعلیم کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا ان کا زوال اور انحطاط شروع ہو گیا۔ اس انحطاط کے دور میں لوگوں کو تعلیم کی اہمیت و افادیت کا احساس ہوا اور لوگ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے لگے۔ ۲۰ ربرس قبل کے مقابلے میں آج ۹۰ر فیصد گھروں کے بچے اسکول جاتے ہیں، آنے والے وقتوں میں حصولِ تعلیم کے شوق میں مزید اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

مبارک پور کا سماجی ڈھانچہ کافی مضبوط ہے، قدیم اقدار، رواداری، اور قومی یک جہتی کے جذبات عام ہیں، مضبوط خاندانی شیرازہ بندی کے سبب سماجی مسائل کم ہیں، انٹرنیٹ اور موبائل کی بہتات نے گزشتہ پانچ سالوں میں اس فضا کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ سیاسی نظریات محدود ہیں۔ اور سرگرم سیاست کا ماحول صرف الیکشن اور کچھ خاص موقعوں پر ہی دیکھا جاتا ہے۔ عوامی پیمانے کی بحثوں میں سیاست تو ضرور شامل ہوتی ہے لیکن ایک سنجیدہ موضوع کے طور پر نہیں۔

مبارک پور کی ایک مخصوص عوامی بولی ہے، اس بولی سے قطع نظر عام طور پر اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والے افراد نظر آتے ہیں۔ اردو کی صورت حال یہاں کافی بہتر ہے اور اردو بولنے والے افراد ۹۵ فی صد ہیں۔ اردو کے فروغ میں یہاں موجود مدارس و مکاتب کا کافی اہم کردار ہے، یہاں کے مدارس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے جس کے سبب طلبہ کی ایک بڑی تعداد اردو سے واقف ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر تحریر کیا، مبارک پور ایک قدیم صنعتی بستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کئی ایک تاریخی عمارتیں بھی موجود ہیں۔ یہاں کی تاریخی عمارتوں میں جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کافی اہم ہے۔ یہ مسجد راجہ مبارک شاہ کے زمانے سے ہنوز آباد ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ راجہ مبارک شاہ اس مسجد میں نمازِ جمعہ کی امامت کیا کرتے تھے۔ دوسری قدیم عمارتوں میں عید گاہ حیدر آباد اور شاہ کا پنجہ حیدر آباد وغیرہ ہیں جو صدیوں پرانی ہیں۔ لاہوری اینٹوں اور چونے سے بنی ہوئی یہ عمارتیں مغلیہ عہد کی یادگار ہیں۔ عید گاہ حیدر آباد میں اب بھی عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ شاہ کا پنجہ نامی عمارت میں حضرت علی کے پنجہ مبارک کا نشان محفوظ ہے۔ یہ کس طرح مبارک پور پہنچا اس کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہے۔ البتہ عمارت کے گنبد اور طرزِ تعمیر سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ بھی مغلیہ دور کی یادگاریں ہیں، ان میں وقتاً فوقتاً تعمیراتی مرمت کے کام کیے جاتے رہے ہیں۔

ایک اہم اور قابلِ ذکر تاریخی عمارت قدم رسول ہے جو مبارک پور کے قلب میں واقع ہے۔ یہ عمارت مغل بادشاہ شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر کی گئی۔

مغلیہ دور کی ایک اور یادگار عمارت معروف بہ شاہی مسجد موضع گجہڑا میں واقع ہے عہدِ شاہجہانی میں یہ علاقہ کفرستان تھا سب سے پہلے سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولادوں میں سے حضرت سید کمال الدین عرف بندگی شاہ کمال تبلیغِ دین کے لیے گجہڑا تشریف لائے۔ آپ کے صاحب زادے محمد صالح جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانے میں تھے، انھوں نے یہاں مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مسجد چونے اور لاہوری اینٹوں سے بنی ہوئی ہے،

اور مغلیہ طرزِ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مسجد کے تین گنبد ہیں، درمیانی گنبد بڑا ہے۔ مسجد کے بیرونی دروازے کے اوپر سنگِ موسیٰ کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ جس پر ابھرے ہوئے حرفوں میں مندرجہ ذیل قطعہ کندہ ہے۔

اس قطع سے اس کا سنِ تعمیر ۱۰۹۹ھ معلوم ہوتا ہے۔

در زمانِ شاہِ عالم گیر دیں پرور کزو
رونقِ دینِ محمد ہست افزوں از قیاس
شد بنَا از فیضِ خورشیدِ کرم للمتقی
مسجدے کز نور آں انجم نماید اقتباس
حاملانِ عرش گفتند از کمالِ کیست ایں
گفتم از ابن الکمال است ایں کمالِ حق شناس
رفعتِ شانش ببیت اللہ فی ماند بفضل
ذرۂ اوجش بہ اوجِ آسماں کردہ مساس
سالِ تاریخش چوں پرسیدم ز میر عقل گفت
از محمد صالح است این مسجدِ احسن اساس

۱۰۹۹ھ

نوابانِ اودھ کے زمانہ میں مبارک پور میں تعزیہ داری کو بہت فروغ ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا رمضان علی شاہ پنجاب کے علاقہ سے مبارک پور آئے۔ وہ اثناعشری مذہب کے عالم و مبلغ تھے۔ یہاں انھوں نے موجودہ مدرسہ باب العلم کے پاس ایک شان دار امام باڑہ شجاع الدولہ کے عہد میں تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیرِ نو ہو چکی ہے، اور قدامت کے آثار ختم ہو چکے ہیں۔

مبارک پور کے محلہ کٹرہ میں بھی ایک قدیم امام باڑہ موجود ہے۔ نواب واجد علی شاہ کی ایما پر اس کے کسی وزیر نے ۱۲۰۴ھ میں اسے تعمیر کرایا تھا۔ امام باڑے میں کل ۹ گنبد ہیں۔ مرکزی گنبد بڑا ہے۔ عمارت چونے اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے۔ روایت کے مطابق اس امام باڑے کے نام ۵۲ر بیگھہ زمین تھی۔ ۱۹۸۴ء کے وقف بورڈ کے کاغذات میں ۴۱۰ر ایکڑ زمین اس امام باڑے کے نام درج ہے۔ اس پر ایک کتبہ بھی ہے۔ ☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باباے عربی حسن الاعظمی

تاریخِ ولادت اور خاندانی حالات

ڈاکٹر محمد حسن الاعظمی علمی وصنعتی قصبہ مبارک پور کے محلہ پورہ دیوان میں ۲۵/ دسمبر ۱۹۱۸ء مطابق ۲۲/ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام امداد علی تھا۔ آپ نے یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ خاندان میں آپ کے علاوہ بھائی علی حسین محسن، فدا علی اور ایک بہن آمنہ تھیں، جن کی شادی محلہ پورہ صوفی میں فدا علی سے ہوئی تھی۔ ان کی بہن آمنہ کے دو بچے سلطانہ اور زاہد علی ابھی مدرسہ دار التعلیم میں زیرِ تعلیم تھے، اسی دوران ڈاکٹر حسن الاعظمی مبارک پور آئے اور ان لوگوں کو لے کر پاکستان چلے گئے۔ اس وقت آپ نے محلہ پورہ صوفی میں عبد اللہ صاحب چیئرمین کے مکان پر قیام کیا تھا اور انھوں نے اپنی لکھی ہوئی ایک کتاب عبد اللہ صاحب چیئرمین کو ہدیۃً پیش کی تھی۔ وہ کتاب تھی ”آج کا مصر“۔

مبارک پور سے مصر تک

آپ کا بچپن انتہائی غربت میں گزرا، بچپن ہی سے آپ کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دار التعلیم واقع محلہ پورہ صوفی، مبارک پور میں ہوئی۔ ملّا جعفر ابن فیاض حسین صاحب ساکن محلہ پورہ دیوان نے ایک ملاقات میں مجھ سے بتایا کہ اعظمی صاحب جب ۱۹۸۱ء میں مبارک پور آئے تھے تو انھوں نے بتایا تھا کہ ”وہ ایک اچھے خطاط بھی ہیں، اور ان کی تحریروں کا ایک یا دو نمونہ مدرسہ دار التعلیم میں

اب تک حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔"

دو سال تک آپ نے مدرسہ دار التعلیم سے حصول علم کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ کرالیا۔ پرائمری درجات کی تعلیم یہیں سے مکمل کی۔ پھر اس کے بعد ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۳۰ء میں حصولِ تعلیم کے شوق میں گھر سے نکلے تو سورت پہنچے اور وہاں جامعہ سیفیہ (فاطمیہ) میں ملا رحمت علی مبارک پوری کی بارگاہ میں اپنا زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہاں آپ نے بطورِ خاص اسلامی فرقوں کی بنیادی کتب اور ادیانِ عالم کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر پہنچے۔

مصر میں آنے سے قبل حسن الاعظمی نے اپنے کئی مراکز تبدیل کیے۔ ابتدا میں جب وہ مبارک پور سے نکلے تو انھوں نے بمبئی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز و محور بنانا چاہا، لیکن حالات سازگار نہ ہونے کے سبب آپ وہاں پر اپنے قدم نہ جما سکے۔ پھر لاہور پہنچے اور اس کو اپنا مستقر بنایا۔ کافی مدت تک وہاں قیام کیا مگر وہاں بھی اپنے مقصود سے ہم کنار نہ ہو سکے۔ وہاں سے ناامید ہو کر حیدر آباد دکن پہنچے۔ حیدر آباد میں آپ نے بیداری کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں بھی ناکامی ہی ہاتھ آئی۔ پھر آپ کراچی پہنچے، جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت کا مرکز اور مستقر بن چکا تھا۔

سیدنا سے اختلاف:

آپ داؤدی بوہرہ فرقے کے پیروکار تھے۔ علمی حلقوں میں یہ بات بھی گشت کر رہی ہے کہ سیدنا نے آپ کو داؤدی بوہرہ فرقے سے خارج کر دیا تھا۔ سیدنا برہان الدین سے آپ کے اختلافات کافی زوروں پر تھے۔ یہ اختلافات علمی بھی تھے اور عملی بھی۔ آپ نے ۱۹۳۷ء میں "انکشاف" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا جواب ملا طاہر سیف الدین نے کراچی کے بوہرہ اکبر علی سیستانی والے کے ذریعہ بنام "محقق" اردو و گجراتی میں شائع کروایا تھا۔ اس کتاب کا جواب اعظمی صاحب نے "خضرِ راہ" نامی کتاب سے دیا جس کا جواب نہیں دیا گیا۔ اعظمی صاحب نے اپنی قوم کے سربر آوردہ رہنماؤں سے اختلاف کی

مختصر داستان اپنی کتاب "عظیم مصر" کے ص: ۳۵۴/ اور ۳۵۵/ پر تحریر کی ہے، جسے ہم قصداً نقل کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

"اعظمیؔ صاحب کی دلی تمنا یہ تھی کہ عالمِ اسلام میں عربی زبان، عربی تمدن، عربی تہذیب اور عربی ثقافت کو فروغ حاصل ہو۔ اسی مقصدِ عظیم و جلیل کے لیے انھوں نے اپنے مستقبل کی حوصلہ مندیوں کو قربان کر دیا۔ وہ بڑی آسانی سے کسی کالج یا یونیورسٹی میں لکچرر یا پروفیسر ہو سکتے تھے، اور اس طرح بغیر کسی پریشانی کے اطمینان و آسائش کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن یہ راستہ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ایثار و قربانی کی راہ کو ترجیح دی۔ ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اور اقدام و عمل کی پوری قوت انھوں نے اسی میدان میں صَرف کر دی۔ انھیں نہ دولت چاہیے تھی نہ ثروت، نہ جاہ و منزلت، صرف ایک چیز جو اُن کی زندگی کا مقصد بن چکی تھی اور وہ تھی عالمِ اسلام کا اتحاد اور مسلم ممالک کے درمیان ثقافتی تعلق کا استحکام۔"(۱)

چند سطروں کے بعد رئیس احمد جعفریؔ مزید لکھتے ہیں:

"پاکستان کے قیام نے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ اعظمیؔ صاحب نے وقت کی اس لہر کو پہچانا اور مصروفِ کار ہو گئے۔ انھوں نے ان تھک کوششیں "موتمر اسلامی" کے قیام میں صَرف کر دیں اور ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج "مؤتمر اسلامی" ممالکِ اسلامیہ و عربیہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

مصر میں اعظمیؔ صاحب نے زندگی کے کئی سال صَرف کیے، ایک مسافر اور ایک سیاح کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مفکر کی حیثیت سے وہاں رہ کر انھوں نے وہاں کے اتار چڑھاؤ، سیاسی، سماجی اور تہذیبی کوائف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے لکھا کم اور سوچا زیادہ، اسی لیے ان کی تحریر میں روانی سے زیادہ وزن ہے۔ انھوں نے مصر کے ماضی

(۱)- عظیم مصر، از: حسن الاعظمی، تعارف از رئیس احمد جعفری، ص: ۱۱، ۱۰، کراچی، اپریل ۱۹۸۱ء۔

وحال پر جس ژرف نگاہی سے روشنی ڈالی ہے، وہ اُن ہی کا حصہ ہے۔"(۱)
جامع ازہر مصر سے آپ کی فراغت ہوئی تو وہیں قاہرہ یونیورسٹی میں آپ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جامعہ ازہر کا شعبۂ اردو آپ ہی کی کوششوں سے عالمِ وجود میں آیا اور آپ اس کے اولین صدر شعبۂ اردو ہوئے۔ پھر وہاں کچھ دنوں تک پروفیسر کے عہدے پر رہ کر تدریسی خدمات انجام دیں۔

مصر میں اردو

ہر دور میں ایک قوم نے دوسری قوم کو اور ایک ملک نے دوسرے ملک کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، بلکہ باہمی تعلقات و روابط بھی قائم رکھے ہیں اور ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے زبان ہی نے وسیلہ اور ذریعہ کا کردار ادا کیا ہے۔ کیوں کہ زبان ہی کسی ملک کے تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ جب کوئی قوم دوسری ہمسایہ یا اجنبی قوموں کی زبان حاصل کرتی ہے تو درحقیقت وہ ان کے علوم و فنون کے بیش بہا سرمایہ سے اپنی ذہنی و فکری ارتقا کا سامان فراہم کرتی ہے۔ تاریخِ عالم اس حقیقت پر گواہ ہے کہ سب سے پہلے مسلم مفکرین نے یونان و ہند کے علمی خزانوں کا سراغ لگایا، اجنبی زبانیں سیکھیں اور ان کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔
حسن الاعظمی صاحب نے محسوس کیا کہ مصری قوم کے اندر بھی یہ جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے، وہ دنیا بھر کی تہذیبوں سے آشنائی چاہتے ہیں اور ان کے اندر مختلف زبانیں سیکھنے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ فارسی اور ترکی کی طرح اردو بھی ان کی پسندیدہ زبان ہے۔ ان کے عہد میں قاہرہ میں اردو کی ہر دل عزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں ہر پنج شنبہ کو "اقبالیات" پر لکچر دیے جاتے تھے۔

جامعۂ مصر میں شعبۂ اردو کا قیام

جامعۂ مصر قاہرہ میں شعبۂ اردو اعظمی صاحب کی کوششوں کا رہینِ منت ہے۔ اس معنٰی

(۱)۔ عظیم مصر، از: حسن الاعظمی، تعارف از رئیس احمد جعفری، ص:۱۱، ۱۲، کراچی، اپریل ۱۹۸۱ء۔

میں دیکھا جائے تو یہ ایک لازوال کارنامہ ہے کہ ایک فرد واحد نے ایک پوری قوم کو اپنی زبان کی طرف مائل کیا۔ بلا شبہہ یہ اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت ہے۔ اپنی اس کوشش کے بارے میں آپ خود اپنی کتاب "عظیم مصر" میں لکھتے ہیں:

"۱۹۳۷ء میں جب میں نے دیکھا کہ جامعۂ مصریہ میں باقی تمام اہم مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اردو کو نظرانداز کر دیا گیا ہے تو کلیۃ الآداب کے پرنسپل ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ اردو کی تعلیم کا بھی بندوبست ہونا چاہیے۔ بہت مشکل سے یہ فیصلہ ہوا کہ اردو ایک اختیاری مضمون کی طرح پڑھی جائے۔ یعنی اس کے نمبر نہ شمار ہوں گے۔ ڈیڑھ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اس عرصہ میں ۲۰ر طلبہ کو اردو پڑھائی۔ شرط یہ تھی کہ اردو صرف وہی طلبہ پڑھ سکتے ہیں، جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں سے واقف ہوں۔ چناں چہ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ طلبہ کو پہلے ایسی اردو پڑھائی جس میں عربی و فارسی کے کافی الفاظ موجود تھے، اِس طرح طلبہ بہتر اردو لکھنا پڑھنا سیکھ گئے، پھر انھیں آہستہ آہستہ آسان لفظ استعمال کرنے کی مشق کرائی۔ غرض عرب طلبہ کو اردو تعلیم کے لیے یہاں سے الٹا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے، مثلاً پہلے اردو چوتھی، پھر تیسری، پھر دوسری پھر پہلی۔ جو اردو یہاں آسان کہی جا سکتی ہے وہاں مشکل ہوگی۔ اس لیے کہ ہندی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں، اور جو مشکل کہی جاتی ہے وہ وہاں آسان ہوگی۔ اور اس طرح ہندوؤں کی متوقع اردو کا ہندوستان سے باہر رائج ہونا ناممکن ہے۔

اس دوران میں نے یہ پروپیگنڈہ جاری رکھا کہ اردو کو دیگر زبانوں کا رتبہ دیا جائے اور اس کے نمبر دوسرے نمبروں میں شمار ہوں۔ آخر میری محنت بار آور ہوئی اور ۷ر مارچ ۱۹۳۹ء کو پارلیمنٹ نے یہ تجویز منظور کر لی اور شاہ فاروق نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ اردو کو موجودہ درجہ دے دیا۔ [1]

تین سال کا نصاب مقرر ہوا اور فیصلہ ہوا کہ پہلے اور تیسرے سال امتحانات ہوں۔

---

(۱)- اس فرمان کی نقل مع اردو ترجمہ "الحیات والموت فی فلسفۃ اقبال" میں موجود ہے۔ ہزار کوششوں کے باوجود یہ کتاب ہمیں حاصل نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر عزامؔ کی مدد سے میں نے عربی اور فارسی جاننے والوں کو اردو پڑھانے کا ایک خاص نصاب تیار کر لیا تھا۔ اس سے پہلے میں زیادہ تر طلبہ کو اقبالؔ اور غالبؔ کی نظم اور بعض ملکی نثر نگاروں کے چیدہ چیدہ شاہ کار پڑھاتا تھا۔"(۱)

مارچ ۱۹۳۹ء میں جامعہ مصر میں باقاعدہ اردو زبان و ادب کی تعلیم شروع ہونے کے بعد اعظمیؔ صاحب نے جامع ازہر مصر کے وائس چانسلر علامہ شیخ محمد مصطفےٰ المراغیؔ کی خدمت میں ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ جامعہ ازہر میں اردو تعلیم کو باقاعدہ شریکِ نصاب کیا جائے۔ شیخ مراغیؔ نے آپ سے وعدہ کیا کہ اگر کوئی موزوں شخص تعلیم دینے کے لیے مل جائے تو کل ہی سے اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے، اور یہاں تک کہا کہ اگر تم جامعہ مصریہ چھوڑ کر ازہر میں آنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو ابھی تقرر کے احکام نافذ کیے جا سکتے ہیں۔

چناں چہ فروغِ اردو کے لیے آپ نے جامعہ مصریہ سے استعفیٰ دے کر جامعہ ازہر میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ آپ کے بعد جامعہ مصریہ میں بہت سے اساتذہ نے اردو کی تعلیم دی۔ ان میں سے ایک پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسفؔ علیگ بھوپالی شاگرد علامہ عبدالعزیز میمنؔ بھی تھے۔

۱۹۸۰ء میں "عین شمس یونیورسٹی" قاہرہ میں بھی اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا جہاں اردو کے پاکستانی مدرس ڈاکٹر امجد حسینؔ نے عرصۂ دراز تک یہ خدمت انجام دی۔ اعظمیؔ صاحب کے بعد جامعہ ازہرہ میں ایم.اے. کے طالب علموں کی تدریس کے لیے مرحوم ڈاکٹر یوسفؔ بھوپالی کا تقرر ہوا جو بعد میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر کیے گئے۔

اردو نصاب کی تیاری

قاہرہ میں اردو کی نشر و اشاعت اور اس کی تعلیم و تفہیم کے لیے آسان کتابوں کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا تھا تاکہ عربی دانوں کے لیے اردو پڑھنا اور پڑھانا آسان ہو سکے، چناں چہ حسن الاعظمیؔ اور ڈاکٹر عبدالوہاب بک عزامؔ نے اس سلسلہ کی

(۱)۔ عظیم مصر، از: حسن الاعظمی، ص: ۳۲۹، ۳۳۰، کراچی، اپریل ۱۹۸۱ء۔

بعض کتابیں تالیف کیں، جن کی اشاعت جنگ کی وجہ سے معرضِ التوا میں پڑگئی۔

اعظمی صاحب نے اس امر کی بھی کوشش کی کہ جامعۂ مصریہ سے نوجوان طلبہ کو ممالکِ ہند مثلاً جامعہ عثمانیہ اور جامعہ علی گڑھ بھیج کر تعلیم دلائی جائے، اس کے لیے تبادلۂ خیالات بھی کیے گئے، لیکن جامعہ علی گڑھ کے اربابِ اقتدار اس کے لیے راضی نہیں ہوئے، حالاں کہ مصر کے سفیر اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ اپنے نوجوانوں کو حکومتِ مصر اپنے خرچ سے حصولِ تعلیم کے لیے ہندوستان بھیجے گی۔ بہ ذریعہ سفیرِ مصر یہ گفتگو بھی ہوئی تھی کہ مصری اساتذہ ہمارے جامعات میں آکر عربی زبان کی نشر واشاعت کریں اور ساتھ ہی ہمارے ادب و ثقافت کو ممالک عربیہ میں متعارف کرائیں۔ اس طرح ہمارے علما مصری جامعات میں آکر اردو دانی کا ذوق پیدا کریں اور وہاں کے حالات و تمدن سے ہمارے ملک کو روشناس کرائیں۔ حکومتِ مصر تو اس کے لیے تیار تھی لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد اس پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔

بغداد، شام اور ترکی میں اردو

قاہرہ میں جو اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز و قلب ہے، اردو خدمات اور اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد اور شام میں اردو تعلیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، اسی طرح ترکی میں بھی اردو زبان کے چرچے ہونے لگے۔ یہ سب اعظمی صاحب کی محنتوں کا ثمرہ تھا، ایک فرد واحد نے جو اپنی ذات میں انجمن کی حیثیت رکھتا تھا، اردو زبان کو عالمگیر شہرت عطا کی۔

تحریک اخوۃ اسلامی کا پس منظر

بقول حسن الاعظمی مصر پر نپولین کے حملے کے کچھ عرصہ بعد مشرق کی سب سے بڑی حکیمانہ شخصیت اور اتحادِ اسلامی کے داعی اور علم بردار شیخ جمال الدین افغانی افغانستان اور ہندوستان میں اپنی فکر و فہم سے انقلابی روح پھونکتے ہوئے مصر پہنچے تھے۔ مصر پہنچتے ہی شیخ جمال الدین کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ ملک اتحادِ اسلامی کے لیے انتہائی موزوں

ہے۔ وہاں آپ کو علامہ محمد عبدہ، سعد زغلول پاشا اور مہدی سوڈانی جیسے مددگار اور شاگرد بھی میسر آ گئے، جن کی وجہ سے آپ کو اتحادِ اسلامی (بنام تحریک اخوۃ اسلامی) کو فروغ دینے کے بہترین مواقع میسر آئے۔ پھر بعد میں جمال الدین افغانی کو کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر مصر سے جانا پڑا، وہاں سے آپ ترکی پہنچے۔ مصر اور ترکی کا انقلاب در اصل آپ ہی کا رہینِ منت ہے۔

جمال الدین افغانی کے بعد محمد عبدہ اور سعد زغلول کی کوششوں اور عملی سرگرمیوں کا ثمرہ شیخ طنطاوی جوہری اور سید رشید رضا جیسی نابغۂ روزگار شخصیات کی صورت میں سامنے آیا۔ شیخ محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کی تجدید کی اور سعد زغلول نے مصر کی سیاست میں اپنے قدم جما لیے۔

شیخ طنطاوی براہ راست جمال الدین افغانی سے فیض یاب اور محمد عبدہ کے تلمیذِ خاص تھے جمال الدین افغانی کا یہ علمی فرزند تنہا ایک جماعت کی طرح ملتِ اسلامیہ کا عظیم الشان کام انجام دیتا رہا ہے۔ شیخ طنطاوی اس بات کے لیے عمر بھر کوشاں رہے کہ مصر سے تحریک اخوۃ اسلامی کی ابتدا ہو، مگر اس کو سیاست سے علاحدہ رکھا جائے تاکہ دنیائے اسلام کو قرآنی اصول اور اسلامی ثقافت سے آشنا کرایا جا سکے۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنی تفسیر قرآن "تفسیرِ جوہری" کے مقدمہ میں "اخوۃِ اسلامی" کا تذکرہ کیا ہے۔ بقول آپ کے آپ تیس سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے کہ اخوت کی تحریک کو عملی جامہ پہنایا جائے لیکن آپ کی یہ کوشش عملاً کامیاب نہ ہو سکی۔

تحریک اخوۃِ اسلامی اور حسن الاعظمی

اعظمی صاحب ۱۹۳۷ء میں مصر پہنچے تھے۔ آپ اپنے اسبابِ ہجرت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سینتیس اڑتیس سال قبل برصغیر کے دس بارہ کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایسا رہنما نہ تھا جس پر اکثریت اعتماد کر کے اتحادِ اسلامی کا منصوبہ بناتی، یہ میری جوانی کا دور تھا، میں اردو

فارسی پرعبور حاصل کر کے عربی میں منہمک تھا کہ اس قرآنی آیت نے مجھے اتحاد کے منصوبہ پر ابھارا۔ آیت یہ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾

اس آیت کا نچوڑ یہ ہے کہ جب فرشتے ایسے لوگوں کو وفات کی منزل میں پہنچائیں گے جو اپنے نفوس پر ظلم کیا کرتے تھے، ان سے فرشتے کہیں گے کہ تم دنیا میں کس حالت میں تھے، وہ جواباً کہیں گے کہ ہم کو زمین میں کمزور بنا لیا گیا تھا، یعنی ہم پر حکومت کی جاتی تھی، یہ جواب سن کر فرشتے کہیں گے کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر کے غلامی سے غلو خلاصی کرتے؟ آخر میں فیصلۂ ربانی ہوتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس آیت نے مجھے ہجرت پر آمادہ کیا، پہلے اس زمین کا رُخ کیا جہاں سے ہر قسم کی غلامی کے خاتمہ کا اقدام کیا گیا تھا، جو سید الانبیا، خیر البشر محمد بن عبداللہ علیہ الصلاۃ والسلام کی جائے پیدائش تھی، مکۂ مکرمہ میں حج کے موقع پر پہنچا۔ حج ایک عالمی کانفرنس ہے جو سال بھر میں ایک بار مسلمانانِ عالم کو اللہ کے اس حکم کے لیے یکجا کرتا ہے کہ وہ باہم مل کر اتحاد کی کوشش کر کے غلامی کے ہر اثر کو کافور کر دیں۔ وہ صرف قربانی کر کے اور زم زم کا پانی لے کر، الحاج بن کر اس انقلابی زمین سے واپس نہ چلے جائیں۔

حسرتؔ موہانی سے ملاقات

مجاہدِ آزادیٔ ہند حضرت مولانا حسرت موہانی سے حسن الاعظمیؔ صاحب کی ملاقات اسی سفرِ حج میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے مختصر احوال بیان کرتے ہوئے اعظمیؔ صاحب رقم طراز ہیں:

میں نے اس نادر موقع پر حریت پسندوں سے طویل گفتگو کی اور حسنِ اتفاق سے بمبئی سے

ہی جہاز کے عرشہ نے مجھے پیکرِ حریت حسرتؔ موہانی سے دوچار کردیا تھا۔ وہ برصغیر کو حریت دلانے میں فنا تھے تو میں سارے ارض اللہ کے موحدوں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے کے منصوبے بنانے میں غرق تھا۔ حج کے موقع پر مختلف ممالک کے مفکروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اِس سفر کے بعد اُن ملکوں کا علمی وفکری دورہ کیا جہاں اللہ عزوجل کے رسولوں کی اکثریت نے مختلف ادوار میں غیراللہ کی غلامی کے خاتمہ کا پیغام دیا تھا۔ میں نے عراق، اردن، فلسطین، شام، لبنان، مصر وغیرہ کا علمی دورہ کرکے اپنے منصوبہ کے لیے قاہرہ کو مناسب ترین شہر پایا جو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا، جہاں اسلامی دنیا کی سب سے قدیم اور بڑی یونیورسٹی جامع ازہر ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اسّی سال قبل داعیِ اسلامی علامہ جمال الدین افغانیؔ نے ہند وایران وغیرہ کا دورہ کرکے قاہرہ ہی کو اپنے اتحادی افکار کی اشاعت کا مرکز بنایا تھا اور ان کی ہم نوائی مصر کے امام مفتی محمد عبدہؔ اور شام کے عبدالرحمٰن کواکبیؔ اور سوڈان کے سید احمد مہدیؔ وغیرہ نے کی تھی۔" (بحوالہ عظیم مصر)

جامعہ ازہر قاہرہ میں حسن الاعظمیؔ کا قیام اس ہوسٹل میں تھا جس میں ایک مدت تک شیخ محمد عبدہؔ رہ چکے تھے اور جس کے اطراف کے کمروں میں شیخ جمال الدین افغانیؔ نوجوانوں کو اپنی تحریکِ اخوۃ سے آشنا کراتے رہے تھے۔ ازہر کی خوش گوار فضا اور مصر کا اسلامی ماحول اس بات کا متقاضی تھا کہ مصر میں تحریک اخوت کا عملی طور پر آغاز کیا جائے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مصری مسلمان خود کو مسلم تصور کرتے تھے، کبھی اپنے آپ کو شیعہ اور سنی کے خانوں میں نہیں بانٹا تھا، حالاں کہ وہاں یہ فرقے موجود تھے۔ اعظمیؔ صاحب کو وہاں کا ماحول اس لیے بھی زیادہ راس آیا کہ انھوں نے بچپن میں سنیوں کو سنیوں سے اور شیعوں کو شیعوں سے خوں ریز لڑائیاں کرتے دیکھا تھا، اس لیے تسنن اور تشیع کے تصور سے ہی ان کو نفرت سی ہوگئی تھی۔

اور دوسری وجہ ازہر کا بین المسلکی ماحول تھا۔ وہاں ہر ملک اور ہر فرقے کے طلبہ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ اس غرض سے سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں اعظمیؔ صاحب نے

مختلف جہاتِ عالم کے برگزیدہ علما اور مفکرین کو قاہرہ میں ہندی سوسائٹی کے دفتر پر جمع کیا۔ یہ اگرچہ ایک تعارفی اجتماع تھا مگر اس کے نتائج بہت شان دار برآمد ہوئے۔ اس اجتماع میں مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے کہ محض تقریروں اور گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد ہونا نہیں ہے، اس لیے ٹھوس حکمتِ عملی اور منصوبہ بند طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۹۳۸ء میں "جماعت الاخوۃ الاسلامیہ" نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ اگرچہ تحریک کو ۱۹۳۹ء کی جنگ میں کافی نقصان پہنچا مگر اعظمیؔ صاحب تندہی سے اپنے کام میں لگے رہے اور تنظیم کے ذریعہ ۱۹۳۸ء میں ہی شہنشاہِ ایران رضا شاہ پہلویؔ کی زندگی سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر سے پیش کی۔ اس تصنیف کا سیاسی حصہ ایک نوجوان محمود ساوائیؔ نے، جس کا خاندانی تعلق ایران سے تھا، لکھا۔ اعظمیؔ صاحب نے اس کتاب میں مذہبی حصہ پیش کیا اور شیعہ سنی اتحاد کے لیے وہ تمام دلائل پیش کیے جن کی اس وقت شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

مذکورہ کتاب کا انتساب چوں کہ رضا شاہ پہلویؔ کے نام تھا، اس لیے کتاب کے چند نسخے طہران بھی بھیجے گئے۔ رضا شاہ پہلوی تنظیم کے اس کام سے بہت خوش ہوئے اور اس کے مذہبی حصہ کا ترجمہ فارسی میں کروا کر شائع کیا نیز اعظمیؔ صاحب کو دورۂ ایران کی دعوت بھی دی تاکہ شیعہ سنی اتحاد کے لیے مزید کام کیا جا سکے۔

کرنل عطاء الرحیمؔ رقم طراز ہیں:

"تین سال کی متواتر جدوجہد کے بعد ۱۹۴۰ء میں کم و بیش ساٹھ ممالک کے نمائندے تحریکِ اخوت کے اجتماعات میں حصہ لینے لگے، ایک چیز جو اِن اجتماعات میں روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمانانِ عالم کے بین الاقوامی اجتماعات چاہے جیسے بھی ہوں، ان میں کارروائی صرف عربی زبان میں ممکن ہے۔ چناں چہ عربی کی سیاسی اہمیت کا یقین غیر عرب نمائندگان کو بھی ہو گیا اور اب عربی کی اشاعت کی تحریک اخوتِ اسلامی کی جدوجہد کا لازمی جُز قرار پائی۔

"اخوتِ اسلامی" کا عملی خاکہ پیش کرنے والا طالب علم اپنے معرب نام "حسن الاعظمیؔ" سے مشہور ہونا شروع ہوا اور علامہ طنطاوی جوہریؔ ان کی عملی جدوجہد سے اس قدر متاثر ہوئے

کہ انھوں نے ان کے ساتھ وہی شفقت شروع کی جو صرف باپ اور بیٹے میں ہوتی ہے۔ چناں چہ اب حسن الاعظمی کی ذات "تحریک اخوتِ اسلامی" کی مرکز بن گئی۔

۱۹۴۸ء کے وسط میں پاکستان کو مرکز بنا کر یہ تحریک کراچی میں شروع کی گئی جو بعد میں "مؤتمر عالمِ اسلامی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مؤتمر کی ابتدائی کامیابی کے بعد اعظمی صاحب نے مشرق وسطیٰ اور ترکی کا دورہ کر کے ہر ملک میں اس تنظیم کی شاخیں قائم کیں۔ مصر کی شاخ کے صدر احمد حمزہ پاشا اور سکریٹری پروفیسر امین الخولی مقرر ہوئے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۸ء میں ہی آپ ماڈرن عربک کالج کراچی میں پرنسپل ہوئے۔ اس سے قبل ۱۹۴۴ء میں آپ نے "انجمن اشاعتِ عربی" کی تشکیل کی تھی اور اس کے جنرل سکریٹری تھے۔

۱۹۴۹ء میں پہلی عالمگیر مؤتمر کا افتتاح آنسہ فاطمہ جناح نے فرمایا اور صدارت شبیر احمد عثمانی نے فرمائی۔ ۱۹۵۱ء میں دوسری مؤتمر کا افتتاح لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے اور صدارت مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے کی اور مؤتمر نسواں کی صدر سیدہ ماہِ منیر جزائری وزیر تعلیم ایران تھیں۔ ۱۹۶۲ء میں دوبارہ مصلحتاً اس تنظیم کا نام بدل کر "اتحاد العالم الاسلامی" اختیار کر کے رجسٹرڈ کرایا گیا۔ [1]

اقبال اور اخوت العالم الاسلامی

حسن الاعظمی صاحب اپنی کتاب "عظیم مصر" میں لکھتے ہیں:

"اخوت کا دستور العمل تیار کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد کی تشریح و تعیین کے لیے علامہ طنطاوی جوہری اور ڈاکٹر عبد الوہاب عزام سے مدد لی گئی اور ان کے مشورے سے ہر ملک کے نوجوانوں کو موقع دیا گیا کہ اپنے ملک کے لیڈروں اور مفکروں کا تعارف کراتے ہوئے ان کے افکار و خیالات کو عربی میں پیش کریں تاکہ ان سے انجمن فائدہ اٹھا سکے۔ اس ضمن میں میں نے اس زمانے کے دنیائے اسلام کے مفکرِ اعظم علامہ اقبال کے

---

(۱)۔ عظیم مصر، ص: ۲۷۶ تا ۲۸۱ کی تلخیص۔

ان تمام خیالات ونظریات کو جو فارسی، اردو اور انگریزی میں موجود ہیں، اور جو مسلمانوں کے اتحاد واخوت کی دعوت پر مشتمل ہیں، بتدریج پیش کرنا شروع کر دیا۔ نیز آپ کی اس قسم کی تقریریں اور تحریریں مصری رسائل میں بھی شائع ہونا شرع ہو گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ اقبالؔ اخوت کے تمام جلسوں میں دیگر تمام مفکرین میں نمایاں نظر آنے لگے اور اخوت نے اس کے اسلامی حقائق وافکار کو عربی میں شائع کرنے کا قصد کرلیا، جس کا اظہار صدر امین ڈاکٹر عبد الوہاب عزامؔ نے رضا شاہ پہلویؔ کی زندگی کے تعارف میں کیا ہے۔ نیز علامہ اقبالؔ کے ''شکوہ وجوابِ شکوہ'' میں جو عربی نظم میں پیش کیا گیا تھا، بہت پسند کیا گیا۔ ان کے مشہور ترانہ چین وعرب ہمارا[۱]، کو اخوت نے اپنا لیا، اور یہ ترانہ اخوت کے ہر جلسہ میں بطور قومی وملی گیت پڑھا جاتا ہے۔ (بحوالہ عظیم مصر)

لاہور میں اخوۃ وکلیہ کا قیام

حسن الاعظمیؔ تحریر کرتے ہیں:

پنجابی نوجوانوں کے بے حد اصرار پر اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں وہاں کے مفکرین اور پروفیسروں کو یک جا کر کے اخوۃ کی دعوت دی اور یک شنبہ ۲۵/ شوال ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۶/ نومبر ۱۹۴۱ء کو چند شخصیتوں کے حسبِ مشورہ اخوۃ کی شاخ قائم کر دی گئی اور اخوۃ کے مرکزی دفتر میں جو سرکلر روڈ پر واقع تھا، ہر جمعہ کو عربی اور اردو میں تقریریں شروع کی گئیں، جن میں بعض ہندوستانی علما کے ساتھ اہلِ زبان بھی شرکت کرنے لگے۔ اس کا عملی اثر یہ ہوا کہ بعض پنجابی زبان کے حامیوں نے خطرہ محسوس کیا اور کہ دیا کہ اگر فلاں [یعنی حسن الاعظمیؔ] یہاں دس سال رہ گیا اور اپنی یہ تحریک چلاتا رہا تو پنجاب کی زبان عربی بن جائے گی، حالاں کہ میں پنجاب تو کیا ساری دنیا کی زبان عربی بنا دینے کا متمنّی ہوں، بلکہ میرا ایمان ہے کہ مسلمان بغیر عربی جانے صحیح طَور مسلمان نہیں ہو سکتا۔[۲]

---

(۱)- یہ ترانہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ [پیامی]
(۲)- عظیم مصر، ص: ۲۹۰، ۲۹۱۔

اس تحریک نے پاکستان میں "موتمر عالم اسلامی" نام اختیار کیا اور موتمر کے پہلے اجلاس میں ۱۸ر ممالک اور دوسرے اجلاس میں ۳۸ر ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ پھر ۱۹۶۲ء میں مصلحتاً موتمر کا نام بدل کر "اتحاد العالم الاسلامی" اختیار کر لیا گیا۔[۱]

لاہور میں رابطۃ التالیف والترجمہ

اعظمیؔ صاحب کہتے ہیں:

اسلامی ممالک میں لسانی یک جہتی کو مدِ نظر رکھ کر مسلمانانِ عالم کی مشترکہ زبان عربی کی ہر ممکنہ اشاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہندوستان میں جہاں کروڑوں مسلمان بستے ہیں، عربی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، بقول جمال الدین افغانیؔ:

"برسوں عربی مدارس میں پڑھنے کے باوجود بھی چند سطریں صحیح نہیں پڑھ سکتے اور ایک جملہ بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔"[۲]

مصر سے واپس آنے کے بعد اعظمیؔ صاحب کو کراچی سے کشمیر تک دورہ کا موقع ملا۔ اس دوران آپ برابر "اخوت" اور عربی کے فروغ کے لیے مدارس، کلیات اور علمی سوسائٹیوں میں تقاریر کرتے رہے۔ اس دورہ سے آپ کو احساس ہوا کہ اپنی جڑ سے کٹ چکے مسلمانوں میں اب بھی کچھ نہ کچھ عربی کا ذوق اور قرآن کی اشاعت کا شوق موجود ہے، لیکن طریقۂ تدریس غلط ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوستانی بچے کو عربی زبان صرف و نحو کی مدد سے پڑھائی جاتی ہے، پھر اکثر کتب فارسی زبان میں ہیں، گویا عربی پڑھنے پڑھانے والے کو سب سے پہلے فارسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہاں قواعد کو تو اہمیت دی جاتی ہے لیکن زبان کو نہیں، حالاں کہ زبان سیکھنے کے بعد قواعد کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان تمام مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اعظمیؔ صاحب نے ۲۰ر رمضان ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لاہور کے عربی دانوں کا ایک اجتماع کر کے رابطہ کی بنیاد ڈالی تاکہ

---

(۱)۔ عظیم مصر، ص: ۲۹۰ حاشیہ۔
(۲)۔ عظیم مصر، ص: ۲۹۱۔

مفید کتابوں کی اشاعت کی جا سکے اور عربی کو ہر دل عزیز بنایا جا سکے۔ "رابطہ" نے متعدّد کتب شائع کرنے کے بعد اردو عربی اور عربی اردو لغات کا کام شروع کیا۔ لیکن لاہور میں کاغذ کی کمی کی وجہ سے اس کا دفتر حیدر آباد دکن میں منتقل کر دیا گیا، اور یہاں ڈکشنری کی طباعت شروع کی گئی۔

متعدّد درسی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ "رابطہ" نے یہ کتب مصر و لبنان میں شائع کیں۔ القائد الاعظم، جنة الارض کشمیر، فتی الهند و قصة الباكستان، الوحدة فی الشرق، فلسفه اقبال، درر الحكايات والذكاهات، ديوان الامير تميم الفاطمی۔ اس طرح "رابطہ" نے کل ایک سو دس کتابیں شائع کیں۔ ۱۹۴۷ء میں اس رابطہ کا مرکز کراچی منتقل کر دیا گیا۔

الكلية العربية و معهد القرآن

ڈاکٹر حسن اعظمی صاحب مزید لکھتے ہیں:

۹ر صفر ۱۳۶۶ھ میں انجمن اشاعت عربی کا دستور العمل جلسۂ عام میں منظور کیا گیا اور اسے کل ہند تحریک بنا کر ذیل کے مقصد کی تکمیل کے لیے نافذ العمل کیا گیا۔

کل ہند انجمن اشاعت عربی کا مقصد عربی زبان کی بطور زندہ زبان کے اشاعت کرنا اور ہندوستان کے مدارس و کلیات میں کوشش کرنا کہ اس کو مسلمانوں کی لازمی زبان قرار دی جائے۔

انجمن کی خواہش پر صدر انجمن سلطان مکلا نے اپنی قیمتی اسلامی لائبریری جو تین ہزار کتب پر مشتمل تھی مع الماریوں کے انجمن کے لیے وقف کر دی اور ایک عربی کالج و معہد القرآن کی عمارت کے مصارف برداشت کیے جس میں کم سے کم مدت میں عربی اور قرآن حکیم کی تعلیم دی جائے گی اور عربی ممالک میں تعلیم پانے والے طلبہ کے لیے خالص عربی ماحول پیدا کیا جائے گا۔ اس کالج کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے وزیر اعظم حیدر آباد نے "ازہر" کی طرز کا ایک عربی کالج بنا دینے اور ممکنہ مالی امداد کا وعدہ کیا۔(۱)

(۱)- عظیم مصر، ص: ۲۹۳

اس پر حاشیے میں اتنی عبارت کا اضافہ ہے:

"یہ کلیہ زیرِ ادارت علامہ المامون دمشقی برسرِعمل ہے اور اسی نام کا دوسرا کلیہ ۱۹۴۸ء سے کراچی میں قائم کیا گیا ہے، جسے حکومت پاکستان منظور کرتے ہوئے سالانہ امداد دے رہی ہے۔"(۱)

پھر آگے تحریر کرتے ہیں:

جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ میں صدرِ انجمن نے مجلسِ عاملہ کے دستخط سے اپنا ایک خصوصی خط اور "المعجم الاعظم" کے ہدیہ کے ساتھ جلالۃ الملک شاہ فاروق (بادشاہِ مصر) کی خدمت میں ایک یادداشت روانہ فرمائی جس میں درخواست کی گئی کہ انجمن کی جانب سے ہندوستان سے جو منتخب طلبہ عربی تعلیم کے حصول کے لیے مصر روانہ کیے جائیں، ان کی تعلیم کے لیے وہ اپنی حکومت کے نام احکام جاری کریں اور جلالۃ الملک کی خدمت میں اس پر ہدیۂ تشکر پیش کیا گیا ہے کہ جامعہ مصریہ میں شعبۂ اردو قائم فرما کر اس کی پروفیسری کی جائدادیں قائم کی ہیں۔(۲)

اعظمی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ شبینہ مدارس کے قیام سے اس تحریک کو ہر دل عزیز بنایا گیا اور انجمن کے تقریری مقابلہ میں ایک سو انعامات تقسیم کیے گئے۔

کتاب "عظیم مصر" کی طباعت کے وقت "پاکستان عرب کلچرل ایسوسی ایشن" کے نام سے یہ تحریک نیم سرکاری حیثیت سے جاری تھی۔ پہلے ۱۹۴۷ء میں "آل پاکستان انجمن اشاعت عربی" کے نام سے تحریک شروع کی گئی تھی، دونوں تحریکوں کے صدر اول مولانا شبیر احمد مرحوم تھے۔ اس انجمن کے قیام سے پہلے حیدر آباد دکن میں علامہ عبداللہ رشید مکی کی صدارت میں تحریکِ اخوت کی ابتدا کی گئی تھی، لیکن بعد میں ناسازگاریِ حالات کے سبب اس کے اراکین نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

---

(۱)۔عظیم مصر، ص: ۲۹۳۔ حاشیہ
(۲)۔عظیم مصر، ص: ۲۹۳۔

پھر بعد میں انجمن اشاعت عربی و رابطۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے تیار کردہ کتب کی نشر و اشاعت کے لیے "ادارۂ معارفِ اسلامیہ ہند" کی بنیاد ڈالی گئی جس کے حسب ذیل مقاصد شمار کیے جاتے تھے۔

- عربی کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا۔
- عالمِ اسلام کے مشہور و ممتاز مفکرین و زعما کی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کے نقوش کو اجاگر کرنا۔
- عالمِ اسلامی سے ربط و ضبط پیدا کرنے کے لیے تصنیف و تالیف کے ذریعہ اخوتِ اسلامیہ کے جذبہ کو بیدار کرنا۔
- اسلامی ثقافت اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں خواتین کے مراتب اور ان کے زندہ جاوید کارناموں کی اشاعت کرنا اور انھیں علمی و عملی میدان میں آنے کے لیے تیار کرنا۔

اس ادارہ کے زیرِ اہتمام متعدّد کتابیں شائع ہوئیں جن میں قابلِ ذکر المعجم الاعظم یعنی عربی اردو لغت با تصویر، آزاد مصر، فلسطین، مجاھدِ مراکش، شرعی پردہ، حیات محمد عبدہ، القراءۃ القرآنیہ وغیرہ ہیں۔

"اتحاد العالم الاسلامی" کے چند بنیادی اصول

اب ہم ذیل میں عالمی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی کے چند بنیادی اصول ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو حسن اعظمیؔ (بانی تنظیم) کے فکر و مزاج کا آئینہ ہیں۔ یہ اصول آپ کی کتاب "عظیم مصر" کے ص:۳۵۹ پر درج ہیں۔

- اللہ جل جلالہ بغیر کسی شریک کے معبودِ حقیقی ہے۔
- محمد عبد اللہ (ﷺ) خاتم الانبیا، رسولِ اعظم و سید البشر ہیں۔
- قرآن کریم اسلام کا بنیادی دستور ہے۔
- بیت اللہ کعبہ قبلۂ مسلمین ہے۔

- متفق علیہ احادیث و سنت نبوی پر ایمان کامل ضروری ہے۔
- صحابۂ کرام و فقہائے عظام کی اسلامی و علمی خدمات کا اعتراف کر کے ہر مناسب فقہی مسئلہ سے استفادہ کرنا لازم ہے۔
- قرآن کریم کے ان احکام کی روشنی میں صرف مسلم و مومن کہنا فرض ہے۔ وہ احکام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ (س:۳، ت:۱۹)

(۲) اس (اللہ) نے تم کو مسلم نام دیا ہے۔ (س:۲۲، ت:۷۸)

(۳) سارے مومن ایک دوسرے کے حقیقی بھائی ہیں۔ (س:۴۹، ت:۱۰)

مقالہ معتمدِ عمومی اخوتِ اسلامیہ قاہرہ

حسن الاعظمیؔ کے فکری جہان کی نمائندگی کرنے والا ایک مضمون جو قاہرہ سے شائع ایک عربی کتاب میں شامل ہے اس کا اردو ترجمہ "عظیم مصر" میں شامل ہے۔ ہم اسے یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ آپ کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جماعتِ اخوتِ اسلامیہ کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عالمِ اسلامی کے بڑے بڑے مشہور و معروف مفکرین و زعما کے حالات، ان کے افکار و نظریات کو عربی زبان میں پیش کیا جائے تاکہ دیگر زبانوں کے ترجمے اور ان نمائندوں کے ذریعہ ان کی نشر و اشاعت میں سہولت ہو۔ چناں چہ اسی مقصد کے پیشِ نظر شاہ پہلویؔ کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی اور مستقل کتاب کی صورت میں عربی زبان میں اس کو شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا مذہبی حصہ اخوت کے معتمد عمومی (حسنؔ الاعظمی) نے لکھا جس کا فارسی ترجمہ طہران میں شائع کیا گیا جو ایرانی دنیا میں حد درجہ مقبول ہوا اور حکومتِ ایران نے "معتمد" کو ایران کے دورہ کی دعوت دی۔ ذیل میں اس کے مقاصد کا خلاصہ درج ہے:

موجودہ دور میں ہم کو اس امر کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہم ایک دوسرے کے آرا و افکار سے روشناس ہوں، کیوں کہ باہمی تعارف سے تعلقات مستحکم اور اخوت کا رشتہ پائدار ہوا کرتا ہے۔ میں قارئین کے سامنے اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اگرچہ جامعہ ازہر سے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی لیکن میرے ہندوستان سے مصر آنے سے پیش تر مجھے تمام اسلامی مذاہب سے خصوصاً اور دیگر مذاہب سے عموماً

خاص شغف اور دل چسپی رہی ہے۔

کیوں کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سال بھر مذہبی مناظرات کا اکھاڑا گرم ہوا کرتا ہے اور مناظر کو دوسرے فریق کے دلائل و براہین سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے میں نے بھی تمام اسلامی جماعتوں میں سنی و شیعہ کے اصول اور ان کے مختلف مذاہب کی فروعات کا درس حاصل کیا۔ من جملہ ان مذاہب کے شیعہ امامیہ یا اثنا عشریہ میں جن کے متعلق ہم یہاں بحث کریں گے۔ انہی متعدّد اسلامی فرقوں کا غم میرے سینے میں موج زن ہوتا ہے کہ ان میں ہر فریق اپنے آپ کو خاص معتقدات اور مسالک کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ہر فریق نے اپنا ایک علاحدہ مذہب و دین بنا رکھا ہے جس کا روزہ الگ، جس کی نماز جدا، جس کے حج و زکاۃ علاحدہ، جس کے معاملات، حدود اور آداب کے اصول جداگانہ ہیں۔ پھر میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ ہر فریق دوسرے فریق کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے۔ اگر اس پر دست رس حاصل نہیں تو ایک دوسرے کو کافر ٹھہرانے، فاسق اور بدنام کرنے کی طرف قصد کرتا ہے۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان جو بھی اپنے بھائیوں کے ہاتھوں ایسی اذیتوں، بلاؤں اور خوں ریزی میں مبتلا ہوئے، جو ان کے دشمنوں سے سرزد ہوا کرتی ہیں، حالاں کہ میں نے دوسری قوموں کو بھی دیکھا کہ اگرچہ ان کے اکثر و بیش تر اصول و فروع باہمی متضاد و مغائر ہیں، پھر بھی یہ چیز ان کو آپس میں متحد اور متفق کرنے میں آڑ نہیں ہوتی۔ ان میں سے اکثر جماعتیں مختلف عقائد و خیالات کی پیرو ہیں، جیسا کہ ہندوؤں کا دین مشہور ہے۔ اس کے باوجود زندگی کے تمام بہترین شعبوں کو حاصل کرنے اور بہترین موجودات سے فائدہ اٹھانے کے لیے جانی مالی ہر قسم کی قربانی اور ایثار سے ایک دوسرے کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے، چناں چہ انھی باہمی ہمدردیوں اور تعاون کے ذریعہ انھوں نے ادبی، مادّی، صنعتی اور تجارتی غرض کہ ہر قسم کی علمی و عملی کامیابیاں حاصل کیں اور ترقی کے میدان میں گام زن ہو

گئے۔ بخلاف اس کے بعض ملکوں میں ہزاروں مسلمانوں کے درمیان بعض جاہلوں اور نادانوں اور فتنہ پردازوں کی فرقہ وارانہ ریشہ دوانیوں کی تبلیغ کی وجہ سے قتل و خون کے معرکے برپا رہے۔ میں نے ان جنگوں اور ان معرکوں پر، جن کی شعلہ فشانی کبھی سرد نہیں پڑتی، غور وفکر کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ درحقیقت یہ سب کچھ بغیر کسی سببِ اصلی کے ہے، اس لیے کہ ہر اسلامی فرقہ کا دین اسلام ہے، اس کا قبلہ ایک ہے، اور اس کا قرآن ایک ہے۔ جن چیزوں کو انھوں نے فرقوں کا نام دے رکھا ہے، درحقیقت ان کے دو اسباب ہیں۔

(۱) یا تو ان قدیم سیاسی عوامل کا نتیجہ ہیں جو صدیوں اور نسلوں سے مسلمانوں میں اثر کر گئے ہیں۔

(۲) یا فقہی آرا و افکار کا نتیجہ ہیں جو آج تک برابر موجود ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو جنگ کرنے یا انسانی خون کی متاعِ گراں مایہ کا ایک قطرہ بھی بہانے کی طرف دعوت دے سکے۔ چناں چہ حنفیہ اور شافعیہ ایک ہی مدرسہ میں رہتے اور تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں، اسی طرح ایک مالکی حنبلی کا شاگرد ہے تو ایک حنفی شافعی کا۔ مگر یہ فقہی و مذہبی اختلاف ان کے نفوس کو جلا کر گرد آلود اور ان کے روابط کم زور نہیں کر سکتا۔

سنی اور شیعہ کے درمیان سب سے زیادہ قوی اختلاف کے مظاہر پائے جاتے ہیں۔ یہ آپس میں ایک دوسرے سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ ان دونوں کے درمیان مناقشات اور نزاعات کو بڑھانے کے لیے باطل دعووں، کھوکھلے پروپیگنڈوں اور فتنہ پردازانہ افواہوں کی بہت کچھ گنجائش نکل آئی ہے۔ ہر فریق نے دوسرے فریق کو ذلیل کرنے کے لیے ایسے من گڑھت قصوں کے ذریعہ سلف کے اقوال منسوب کیے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ ایک شخص دوسرے انسان کے متعلق یہ گمان کرے کہ اس کے بھی ایسی دُم ہے جیسے کہ گاے، بیل کے ہوا کرتی ہے۔ یا ایک شخص دوسرے شخص کے متعلق یہ اعتقاد رکھے کہ وہ

ناپاک، نجس اور گندہ ہے۔ حالاں کہ وہی شخص اکثر حیوانات کی طہارت کا قائل ہے۔

پھر کیا ایک انسان اس صداقت کا معترف ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی طرف یہ قول منسوب کیا جائے کہ جبرئیلِ امین علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ وہ حضرت علی کے پاس رسالت و وحی لے کر جائیں لیکن غلطی سے آپ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس راستہ بھٹک کر پہنچ گئے۔ لیکن جب دو فریقوں کے درمیان تعلقات و روابط کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہو تو ایسے حالات میں اس قسم کے خرافات کا پیدا ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے عفو و درگزر کی تعلیم دی۔ اس نے فروعی اختلافات کو نہ صرف اپنے پیرووں کے لیے نظر انداز کر دیا بلکہ غیر قوموں اور غیر ادیان کے ماننے والوں کے بارے میں بھی فروعی چیزوں کے متعلق جھگڑنے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے منع کر دیا۔ اسلام نے ذمیوں نے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے، ان کے دلوں کو موہ لینے اور پناہ لینے والوں کے ساتھ بہترین سلوک اور معاملہ کرنے کا حکم دیا۔ اسلام نے شروع ہی سے تمام بنی نوعِ انسان کے درمیان محبت، دوستی اور اتحاد کو قائم رکھنے کی ہدایت کی۔ بھلا اس نے کب یہ روا رکھا کہ مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے لیے صرف اس وجہ سے خندقیں کھودیں کہ اس نے فلاں کے ساتھ محبت و عقیدت رکھی، یا وہ فلاں شخص کی طرف مائل ہے، حالاں کہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے حریتِ فکر اور آزادیِ رائے کا اولین سنگِ بنیاد رکھا۔ لہٰذا موجودہ دور میں بھی وہ اس قابل ہے کہ اس حریت کا سب سے پہلا علم بردار ہوا، اس کے سلیقہ میں ہزاروں افکار و آرا کی گنجائش اور وسعت ہے جنھیں پیروانِ اسلام نے دنیا کے مختلف ممالکِ اسلامیہ میں پھیلایا اور جن کا ثر سوائے حجت اور مکابرہ کے نہیں رہا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مبارک میراث کو، جو درگزر اور حریتِ فکر و عمل کی میراث ہے، اپنے پریشان شیرازہ کو جمع کرنے کے لیے

استعمال کریں اور ہر قسم کے افترا اور پراگندگی سے پرہیز کریں۔

آں حضرت ﷺ نے تمام دنیا کے لیے اپنی رسالت کا فرض ادا کر دیا اور تمام دنیا میں بسنے والی مخلوق پر اللہ کی محبت پوری کر دی۔ اسلام آپ ہی کے سرچشمہ سے ابلا اور آپ ہی کی ذات کے ذریعہ اس کے چشمے تمام دنیا میں جاری ہوئے، اسی لیے آپ کے وصال سے پیش تر اسلام کے تمام اصول وارکان مضبوط ومستحکم ہو چکے تھے، جس کا اعلان قرآن مجید نے "الیوم اکملت لکم دینکم" سے کیا۔ اس لیے ابناے ملت کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اس عظیم الشان اصول کو اختیار کریں لیکن مسلمانوں کے افتراق اور ان کی خصومتوں کی سب سے بڑی وجہ جس نے ان کے دلوں میں کدورتوں کی آگ کو بھڑکا دیا ہے، یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کے عظیم الشان اصولِ اخوت سے رو گردانی کی۔ یہی چیز مسلمانوں کے تمام فرقوں اور جماعتوں میں ہے۔ خواہ وہ شام میں بسنے والے علوی مسلمان ہوں یا ایران و کردستان میں بسنے والے شافعی اور شیعہ، ان تمام کے درمیان یہی قدر مشترک ہے۔

اس مضمون کے لکھتے وقت میں اپنے سامنے اخبار و جرائد میں لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہندوستان کے شیعہ وسنی فرقہ کے مابین کس قدر خوں ریزی اور فتنہ و فساد کا بازار سرگرم ہے۔ حال ہی میں ہندوستانی اخباروں کے ذریعہ ہمیں یہ اطلاع پہنچی کہ ہزاروں مسلمان جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کر دیے گئے اور بہت سے ہلاک ہو گئے۔

مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک ایسا پاکیزہ اور مبارک درخت بھی ہے جس کی جڑ زمین کی گہرائیوں میں اور اس کی شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں جا چکی ہیں۔ وہ درخت اسلام ہے جس کے بونے والے محمد ﷺ ہیں۔ پیروانِ اسلام کے درمیان کتنا ہی آپس میں اختلاف ہو پھر بھی وہ اسی درخت کی شاخیں ہیں۔ جب شاخیں علاحدہ ہو جائیں تو

آندھیوں کا ایک جھونکا ان کی کلیوں اور پتوں کو گرا دینے کے لیے کافی ہوا کرتا ہے۔

دینِ اسلام کی غرض و غایت سِوا اس کے اور کچھ نہیں کہ انسانوں کے دلوں میں محبت کا ایسا سر چشمہ موج زن ہو جائے جس کے ذریعہ آپ آخرت میں اللہ کی خوش نودی حاصل کریں۔

میری صداے احتجاج کا مطلب یہ نہیں کہ فرقوں کو باطل قرار دے دیا جائے۔ یہ ایک امر محال ہے کہ وہ فرقوں کو محو و نیست و نابود کرنے کا تصور کرے، لیکن ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ جب مختلف ادیان و مذاہب کے پیرووں کے امکان سے یہ چیز بعید نہیں کہ وہ ان تمام کو وطنیت کے نام سے اتحاد کے جذبات مصلحتِ عام کے دعوے کے ذریعہ جمع کر دیں تو کیا یہ امر ممکنات سے نہیں کہ مختلف مسلمانوں کے فرقوں کو وحدتِ دینیہ کے نام سے ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا جائے؟ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہوگا کہ مسلمان اپنے قدیم بغض و عناد کی زنجیروں کو پاش پاش کر دیں اور آپس میں حسنِ سلوک، حسنِ معاملہ اور تعاون و اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ اس کے بعد خود بخود ہر شخص کو یہ قدرت حاصل ہو جائے گی کہ وہ اپنے بھائی کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے اور اس کی غلطی سے آگاہ کرے۔ اور اگر وہ باطل ہے تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو نرمی اور شفقت سے اس کی غلطیوں سے آگاہ کرے نہ کہ اس سے جنگ و جدل کا پیرایہ اختیار کرے۔ جب اس کی کدورتیں دور ہو جائیں گی اور صفائی و پاکیزگی کے جذبات سے سینے معمور ہو جائیں گے تو آپس میں فہمائش کا طریقہ اور کامیابی کا راستہ آسان ہو جائے گا۔

یہ امر قابلِ رشک و مسرت ہے کہ ہم جامع ازہر میں تمام سنی مذاہب کو ایک جگہ مجتمع دیکھتے ہیں اور ایک ہی مقام پر رہ کر تمام علوم حاصل کرتے ہیں، ان کے دلوں میں حسد و کینہ اور بغض و عداوت کے عناصر کی آمیزش نہیں۔ مصر میں دینی و علمی انجمنوں کی حریتِ فکر و عمل پر سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ احکامِ شریعت کے بعض فروع میں انھوں نے شرعی

عدالتوں میں بعض قوانین و دفعات میں تغیر و ترمیم کی غرض سے دیگر مذاہب سے استفادہ کرنے کا قصد کیا، کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے مذہبی نصوص کے مابین تطبیق سے خاندانی اور معاشرتی زندگی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، حالاں کہ دین آسان ہے نہ کہ مشکل۔

حریتِ فکر کا اس سے زیادہ کشادہ میدان اور کون سا ہو سکتا ہے۔ ازہر کی علمی ترقی کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔

جس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا مسائل ہیں جن کے ذریعہ تمام اسلامی جماعتوں کو آپس میں متحد اور ان کے مختلف فرقوں کو اسلام کے ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع کیا جائے تو میں نے اپنی بہت سی آرزوؤں اور مبارک تمناؤں کو اس ازدواجی تعلقات میں پورا ہوتے ہوئے دیکھا جو مشرق کی دو عظیم الشان سلطنتوں مصر و ایران کے دو بڑے خاندانوں کے درمیان وابستہ ہونے والے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب دو بادشاہوں کے درمیان اتحاد و درستی کا مظاہرہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ملکوں کے درمیان رشتۂ مودت و الفت قائم نہ ہو جائے۔ یہ مبارک اور سعید میل جول جلالۃ الملک فاروق کے خاندان اور شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے خاندان کے درمیان ایک عظیم الشان وسیع اقدام اور بلند بانگ آواز ہے جو اسلام کے منبر سے دینی ربط و ضبط کے مظاہرہ کے لیے بلند کی گئی۔ اس دن سے ہم نے اخوت کا مشاہدہ کر لیا کہ یہ اخوت ایک علمی چیز ہے نہ کہ صرف کلامی۔ نیز یہ ایک حقیقت ہے نہ کہ خیال، یہ یقینی ہے نہ کہ ظنی۔ چناں چہ شیخِ ازہر نے طیبِ خاطر سے اس عقد کے لیے شان دار استقبال کیا اور محفلِ عقد کی رسم ادا کی جن کی آواز مصر و ہندوستان، مشرق و ایران کی فضاؤں میں گونجنے لگی۔

اگر ایسا دن آجائے جس میں تمام مسلمان اپنے اختلافات کے باوجود جامع ازہر میں جمع ہو جائیں اور علمی، اخلاقی، ثقافتی غرض کہ ہر قسم کی ترقی کے اسباب و وسائل پر غور کریں اور

اپنی جماعت کو متحد اور مرکب کر دیں تو اس سے صرف مواخات اور باہمی روابط کو ہی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ تمام اسلامی ممالک کے لیے بھی ایک روشن مثال قائم ہو جائے گی۔

اخوتِ اسلامیہ اللہ کی عبادت کے بعد شرعی واجبات و فرائض کا ایک جز تھی، مسلمان اس فریضہ کی انجام دہی پر کمر بستہ تھے اور آں حضرت ﷺ کے زمانہ میں مضبوطی سے اس رشتۂ مودت و اخوت کو تھامے رکھا۔

خلفائے راشدین کا دور بھی نہایت خوش گوار گزرا، لیکن جب بنی امیہ اور اہلِ بیت کے درمیان نزاعات اور فتنہ و خصومت کا دور شروع ہوا تو مسلمانوں کے درمیان بغض و عداوت کے عناصر کا جوش بڑھتا رہا۔ انھوں نے اپنے شعار اور اپنی جماعت کی عظمت اور وقار کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ مختلف قسم کی فتنہ پردازیوں اور جھوٹے پروپیگنڈوں میں مصروف ہو گئے۔ دین کی مختلف تفسیریں اور تعبیریں نکالیں اور اسلامی روح کو فنا کر دیا۔

بہت سے لوگ الاماشاء اللہ صراطِ مستقیم سے برگشتہ ہو گئے۔ مسلمانوں کے آخری دور میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمانوں پر مضبوط اور ٹھوس چٹانیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ ایک فرقے نے دوسرے فرقے کو کافر بنانا اور فاسق و فاجر ٹھہرانا شروع کیا۔ مبلغینِ دینِ مسیحیت اور اتحاد پرور دماغوں نے اپنے روبرو ان سرحدوں کو کھلا دیکھا تو ان کے ذریعہ عین وسط اور مرکز تک پہنچ گئیں اور مسلمانوں کے مضبوط قلعوں میں داخل ہو کر مختلف طریقوں سے ان پر سنگ باری اور تیر اندازی کی اور مختلف مذہبی پروپیگنڈوں کے ہتھکنڈوں میں ان کو جکڑ لیا۔

انھوں نے اپنے لشکر کی تنظیم ہمارے اختلافات کی اساس پر قائم کی۔ ہماری وحدت کے پرزوں اور ٹکڑوں پر اپنی جماعت بندی کی۔ ہم حیرانی و سراسیمگی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف تکتے ہی رہ گئے۔ نجات اور چھٹکارے کی راہ تلاش کرنے لگے۔ کاش ہم اپنے ہی بھائی بندوں کو چھٹکارا دیے ہوتے تو غیروں کا ہم کو ڈر نہ ہوتا۔

میری رائے میں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے، بالخصوص شیعہ اور سنی کے

درمیان اختلاف کا سبب کوئی قابلِ توجہ نہیں جیسا کہ میں اس سے پیش تر کہہ چکا ہوں اور پھر میں اس دعوے کو لوٹاتا ہوں کہ مجھے کوئی زیادہ فرق ان مختلف فرقوں کے درمیان نظر نہ آیا، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر شخص اپنے ہاتھ سے ایک دوسرے کو ٹٹول کر دیکھے، مگر پہلے اس اساس سے غور کرے کہ سب لوگ مسلمان ہیں، پھر ہر شخص اپنے مذہب میں خود مختار ہے، تاوقتے کہ وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کا باعث نہ بنے، اسی کا اسلام نے حکم دیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی سخت ضرورت ہے، اس کے ذریعہ مشرق کی زندگی استوار ہوسکتی ہے اور یہی ذریعہ ہے فتح و نصرت حاصل کرنے کا۔

پہلا اور آخری سبب اس بیان کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ ہم نے مخلص بھائیوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر "جماعت اخوتِ اسلامیہ" کی تشکیل میں غور و فکر کیا، جو تمام بلادِ اسلامیہ سے اپنے مذہبی اختلافات اور مختلف عقائد کے باوجود ایک جگہ جمع ہوں۔

ہم نے اس جماعت کے افراد و ارکان کے لیے یہ شرط عائد کردی کہ وہ ایسے مذاہب کے پیرو ہوں جو صریح قرآن مجید کی آیات کے مخالف نہ پڑتے ہوں یا سنت اور اجماعِ امت کے مخالف نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے مصر میں ایک وسیع میدان اور سرسبز زمین پائی، کیوں کہ یہاں مختلف جہاتِ عالم کے باشندے جمع ہوا کرتے ہیں۔ مشرق و مغرب میں رہنے والی جماعتوں نے اس جماعت کی دعوت کو سنا اور لبیک کہہ کر جمع ہو گئے۔ اس کے ارکان آج ۳۴ر ممالک کی نمائندگی کرتے ہیں (ملحوظہ) زیادہ تفصیل کے لیے کتاب "رضا شاہ پہلوی و نہضۃ ایران الحدیثیۃ" کی "قسم دینی" دیکھیے۔ (قاہرہ میں شائع شدہ عربی کتاب کے مقالہ کا اردو ترجمہ) [1]

(۱)- عظیم مصر، ص:۳۰۶

حسن الاعظمی کی نظر میں علامہ اقبال کا فلسفۂ ممات

اب تک کی ہماری گفتگو سے یہ واضح ہو چکا کہ حسن الاعظمی صاحب علامہ اقبال کی فکرِ اخوۃ کی ترویج و اشاعت میں کس قدر فعال تھے، اس سلسلے میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں جو عربی و اردو میں شائع ہو چکی ہیں حسن الاعظمی صاحب نے علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ کو عملی طور پر اپنی زندگی میں اتار لیا تھا۔ فلسفۂ اقبال کی اشاعت ان کی زندگی کا نصب العین اور اخوت اسلامی ان کا روحانی مقصد تھا، اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے مسلسل لکھا اور خوب لکھا لیکن مقامِ افسوس ہے کہ انھیں آج تک ماہرِ اقبالیات کے طور پر باقاعدہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

ابھی تک ہمارے علم میں ان کی عربی اور اردو کتب ہی تھیں جو مختلف مقامات سے شائع ہو کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ہم نے اپنا یہ مقالہ تقریباً مکمل کر لیا تھا کہ انٹر نیٹ کی سیر کے درمیان ہمیں یہ علم ہوا کہ آپ کے بہت سارے مقالات فارسی زبان میں بھی ہیں جو ایران کے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں، ہمیں ماہ نامہ "ہلال" ایران کے نصف صدی پرانے کچھ رسائل دستیاب ہوئے جن میں ان کے فارسی مقالات ہم نے دیکھے اور ڈاؤن لوڈ کیے۔ ان مقالات میں آپ نے اقبال کے فلسفۂ حیات و ممات کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کی تحریر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کس قدر اس فلسفے سے متاثر تھے۔ ہم تو فارسی سے ذرا کم ہی واقف ہیں، اس وقت ہمارے ساتھ حسنِ اتفاق سے مولانا منہال رضا خیر آبادی موجود تھے۔ جو اچھے فارسی و عربی داں ہیں، انھوں نے آپ کی تحریر دیکھ کر بے ساختہ کہا کہ "حسن الاعظمی کی فارسی دانی کو ماننا پڑے گا۔" ہمارا خیال تو یہ ہے کہ فلسفۂ اقبال کی تشریح کے لیے جس قسم کی زبان کی ضرورت تھی حسن الاعظمی نے بالکل وہی زبان استعمال کی، اگرچہ زبان قدرے سخت ہے لیکن انتہائی علمی ہے۔ ذیل میں آپ کی کچھ فارسی تحریروں کے خلاصے پیش کیے جاتے ہیں، یہ ترجمے اور خلاصے مولانا منہال رضا

خیر آبادی نے کیے ہیں۔

فلسفۂ ممات: حسن الاعظمیؔ فرماتے ہیں کہ علامہ اقبالؔ ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے قوم و ملت کی اجتماعی بیماریوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجہ تک پہنچے کہ ملت کی تباہی و فرسودگی کا اصلی راز موت سے خوف ہے، جس میں ہر شخص مبتلا ہے اور غیرت و حمیتِ ملی کو فراموش کرنے پر مجبور ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں غلامی کی زندگی کو مرنے پر مقدم کر دیا اور ذلت و اہانت نے انھیں گھیر لیا اور ان کے ساتھ اغیار ذلت آمیز سلوک کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اس خوف کے خلاف پرچمِ جہاد بلند کیا اور متعدّد بار اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر وہ ایک غیر مند ملت بن کر آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو موت کا خوف اپنے دل سے نکال دیں، انسانی سماج کی تاریخ اور سربرآوردہ شخصیات کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس منزل تک پہنچاتا ہے کہ صرف وہی قوم اور وہی افراد سربلند ہوکر زندگی گزارتے ہیں جو موت سے نہیں ڈرتے ہیں۔ مادّی و جسمانی بقا کے لیے اہم ترین خطرہ موت ہے، اگر انسان اپنے دل کو خوفِ مرگ سے پاک کرلے تو بشریت کے اعلیٰ ترین درجاتِ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ اس بات کے اثبات کے لیے علامہ اقبالؔ اسلاف اور نیک سیرت افراد کے واقعات کا سہارا لیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ صالح و پاک باز افراد نے اپنی شہامت و دلیری کے ذریعہ مشرق و مغرب میں اپنا پرچم لہرایا اور یہ غلبہ صرف سیاسی اعتبار سے نہ تھا بلکہ سماجی و ثقافتی اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں بھی کچھ اس قدر حیران کن تھا کہ معجزہ کہا جاسکتا ہے۔ اقبالؔ نے اس عروج و کمال کا اصلی راز موت سے بے خوف ہونا بتایا ہے کہ ان افراد نے سرفروزی و سرفرازی کی راہ میں کسی طرح کے مقابلہ سے دریغ نہ کیا؟ اسی مفہوم کو اقبالؔ نے اپنی نظم شکوہ میں بیان کیا ہے۔

افسوس کہ آج ہمارے دل و دماغ پر موت کا خوف چھا گیا ہے، ہمارے اجسام اس خوف سے لرزاں ہیں، ہمارے راہ نما حضرات دادِ شجاعت، تشویقِ شہامت کے بجائے ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ شمشیر زنی کی بجائے خانقاہوں میں ذکر و یادِ الٰہی میں مصروف رہو، خاکساری کو تاج داری پر ترجیح دو۔

علامہ اقبالؔ نے متعدّد پیرایوں میں مختلف مقامات پر اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ موت سے صرف وہ افراد خوف زدہ ہوتے ہیں جو موت کو فنا تصور کرتے ہیں، اور آخرت وحشر و نشر کے یقین سے محروم ہیں، لیکن وہ افراد کی موت کو آخرت کا دروازہ یا مقدمۂ حیاتِ نو تصور کرتے ہیں وہ موت سے خائف نہیں ہوتے۔ مادّہ پرستی کا سب بڑا فتنہ یہی ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں موت کا خوف پیدا کر دیا۔

اردو کی ایک نظم میں موت کے سلسلے میں نہایت ہی قیمتی تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک خوش الحان پرندے کی طرح ہے جو دنیا کی شاخ پر بیٹھ کر چند لمحہ نغمہ سرائی کرتا ہے پھر اڑ جاتا ہے۔ موت ہر پیر و جواں، شاہ و گدا کے لیے معین ہے اور کسی بھی صورت اس سے نجات ممکن نہیں۔

ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد علامہ اقبالؔ کائنات کے فنا پذیر ہونے کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی فرماتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پروردگار نے بشریت کو اس امتحان میں کیوں مبتلا کیا ہے جب کہ ذاتِ باری کے یہاں فنا کا امکان بھی نہیں ہے، کیا یہ ممکن نہ تھا کہ پروردگارِ عالم اس دنیا اور اس میں بسنے والے افراد کو بھی فنا اور موت سے ہم کنار نہ کرتا؟ اقبالؔ اس سوال کا جواب نہایت حسین انداز میں دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خاکی انسان ایک نامکمل مخلوق ہے جو آتشِ موت سے گزر کر پختہ اور مکمل ہوتا ہے۔ موت ہمارے ناقص پیکرِ خاکی کو حسنِ لازوال عطا کرتی ہے۔

اقبالؔ نے اس حقیقت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بشری طبیعت رنج و سرور کی متقاضی ہے اور یہ دونوں چیزیں اس کے لیے ضروری ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے متعدّد بار اس بات کو دُہرایا ہے کہ انسانی رفعتیں رنج و غم میں پوشیدہ ہیں۔ موت لازمۂ زندگی ہے اگر خزاں نہ ہو تو بہار کا آنا ممکن ہی نہیں ہو گا۔ [1]

---

(۱)- ماہ نامہ ہلال، فروردین ۱۳۴۳ مطابق مارچ ۱۹۶۴ء

مبارک پور آمد

ہجرت کے بعد پہلی بار مبارک پور آمد: ۱۹۸۰ء میں حسن الاعظمی نے ہندوستان کا پہلا دورہ کیا۔ اپنے اس دورے میں وہ مبارک پور بھی تشریف لائے۔ اس کا بیان آپ نے خود اپنی کتاب ''عظیم مصر'' میں کیا ہے۔ آپ کے اس تذکرے میں ہندوستان کے اس وقت کے عصری حالات اور تمدن کی جھلکیاں دکھائی دیں گی۔ مبارک پور کے حالات کا بیان بھی چند الفاظ میں آپ نے کیا ہے، ہم ذیل میں آپ کا یہ تذکرہ نقل کرتے ہیں:

''بیس سال بعد میں نے ہند کا تحقیقی و علمی دورہ ۶/ نومبر ۱۹۸۰ء کو شروع کر کے ۱۵/ جنوری ۱۹۸۱ء کو ختم کیا اور بوہروں کو بے حد مضبوط و ثابت قدم اور بے باک پا کر بہت مطمئن ہوا ہوں۔ ہوائی جہاز سے سفر یقیناً بہت گراں ہے، البتہ ریل سے سفر کرنا ہو تو لاہور سے روزانہ ۲/ بجے ریل روانہ ہو کر ''اٹاری'' ہندی حدود تک جاتی ہے، جہاں سے امرتسر جا کر ہر جگہ کا سفر ممکن ہے اور اٹاری ہی میں سیٹ کو بک کرنا مناسب ہے، جہاں پاکستانی روپے اور امریکی ڈالر سے ہندی سکے بدلے جاتے ہیں۔ ہندی اسّی روپے سو پاکستانی روپے سے اور ساڑھے سات روپے ایک امریکن ڈالر سے ملتے ہیں۔ ڈالر کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، درجۂ سوم کو دوم اور دوم کو اول بنا کر اسی لحاظ سے دام وصول کیا جاتا ہے۔ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ۳۰/ پیسے کا ہوتا ہے، درجۂ دوم کے ڈبے میں پانی کا اچھا انتظام ہوتا ہے، بمبئی کی بسوں میں ٹکٹ کم از کم ۲۵/ پیسے کا ہوتا ہے اور دو منزلہ بسوں کی کثرت کی وجہ سے آمد و رفت آسان ہو گیا ہے، اور بمبئی کی آبادی تقریباً اسّی لاکھ ہے۔ ڈاک اور تار کا نظام نہایت خراب ہے۔ میں نے بنارس سے مبارک پور تار کیا تو ۵۸/ گھنٹے میں میرے جانے کے بعد پہنچا اور ایک عزیز نے مالیگاؤں سے مجھے تار کیا تو ۱۲/ دن میں پہنچا تھا، حالاں کہ مبارک پور میں تار آفس ہے، ڈاک لینے کے لیے ڈاک خانہ جانا

ضروری ہے، البتہ ڈاکیہ کو ماہانہ رقم دی جائے تو گھر تک پہنچاتا ہے۔ یہ بات مبارک پور میں عام ہے اگرچہ اکثریت اقتصادی طور سے خوش حال ہو چکی ہے، اکثر تھانوں میں ہر جگہ ملازم اور افسر صرف ہندو ہیں اگرچہ آبادی میں ۷۵ر فیصد مسلم ہیں، جیسا کہ مالیگاؤں اور مبارک پور میں ہے۔ واپسی کے وقت اٹاری اسٹیشن پر سخت چیکنگ ہوتی ہے، میرے ہم راہ چھوٹے بھائی و بہن کو مبارک پوری رشتہ داروں نے چار بنارسی ساڑیاں اور بچوں کے لیے چند چاندی کے زیورات دیے تھے، جن کو چیکنگ کرنے والوں نے باوجود احتجاج کے رکھ کر ایک رسید دے دی ہے اور ہندی مطبوعات کو پاکستانی بہ آسانی خرید نہیں سکتے ہیں، حالاں کہ دنیا کے ہر ملک سے بہ آسانی خریدتے ہیں۔"(۱)

دوسری مرتبہ مبارک پور آمد: غالباً ۱۹۸۸ء یا ۱۹۸۹ء میں دوسری مرتبہ مبارک پور آئے تو چھوٹی ارجنٹی کے پاس پہنچ کر رکشہ والے سے کہا، بھائی یہ وہ مبارک پور نہیں لگتا، جہاں میرا آبائی مکان ہوا کرتا تھا۔" اس وقت تک مبارک پور کا نقشہ اس قدر بدل چکا تھا کہ آپ کو گمان ہوا کہ کسی دوسرے مبارک پور میں چلے آئے ہیں۔

وہیں بدّو خلیفہ کا چاے خانہ ہوا کرتا تھا۔ کچھ لوگ وہاں چاے نوشی میں مصروف تھے۔ آپ کی آواز سن کر آپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھیں لوگوں میں مشہور محقق اور ماہرِ رضویات ڈاکٹر شرّر مصباحی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے آپ سے گفتگو کی اور آپ کو پہچان لیا۔ پھر آپ کو حاجی محمد خلیلؔ صاحب ساکن محلہ پورہ دیوان مبارک پور کے مکان پر لے گئے۔ وہی مکان ان کا آبائی مکان تھا، جسے حاجی محمد خلیلؔ کے والد کے ہاتھوں بیچ دیا گیا تھا۔ انھیں کے مکان کے پاس داؤدی بوہرہ جماعت کی مسجد ہے۔ وہ مسجد بھی انھیں کے مکان کا ایک حصہ تھی۔ آپ اپنے اس دوسرے سفر میں حاجی محمد خلیلؔ صاحب کے مہمان ہوئے۔ (۲)

---

(۱)۔ عظیم مصر، ص: ۳۵۵، ۳۵۶

(۲)۔ مذکورہ جانکاریاں مولانا انعام الرحمٰن صاحب کے غیر مطبوعہ مختصر مضمون سے ماخوذ ہیں۔

حسن الاعظمی
علما اور دانش وروں کی نظر میں

(۱)-رئیس احمد جعفری مدیر روز نامہ ”زمیں دار“ لاہور اپنے ایک مضمون میں آپ کی سیماب صفت طبیعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”انھوں نے اپنی غیر معمولی جدو جہد کے باعث ملت کی نگاہوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی شخصیت بین الاسلامی حیثیت رکھتی ہے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہو گا۔ اعظمی صاحب سیماب وش طبیعت رکھتے ہیں، کسی پہلو انھیں قرار نہیں آتا، صبح ہو یا شام، دوپہر ہو یا رات، آفتاب کی تمازت ہو یا چاندنی کی بہار، موٹر ہو یا ٹیکسی، ٹرام ہو یا بس، ہر وقت وہ آمادۂ کار نظر آتے ہیں۔ اطمینان و فرصت کا کوئی لمحہ انھیں میسر نہیں۔ (۱)

(۲)-کرنل عطاء الرحیم معتمد رابطۂ تعارفِ اسلامی شعبۂ مؤتمر عالم اسلامی آپ کے تعارف میں رقم طراز ہیں:

”یہ نوجوان اعظم گڑھ کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا، اس نے ہندوستان کی مختلف درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی اور وحدتِ ملتِ اسلامیہ کے جذبے سے متاثر ہو کر حج کے دوران مکہ کا سفر کیا۔ اس کے بعد ممالکِ اسلامیہ و عربیہ کا دورہ کرتے ہوئے وہ قاہرہ پہنچ گیا اور جامعہ ازہر سے ”الشهادة العالمية“ کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اس ڈگری کے حاملین کو علمائے ازہر تصور کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اعظمی نے روپیہ کے بل بوتے پر نہیں کیا، بلکہ عزمِ راسخ کی مدد سے تمام مسائل کو حل کیا۔ اقبالؔ پر مختلف

(۱)-عظیم مصر، از: حسن الاعظمی، تعارف از رئیس احمد جعفری، ص: ۱۰، کراچی، اپریل ۱۹۸۱ء۔

مضامین لکھے اور ایک کتاب کی شکل میں ان کو شائع کیا۔ اقبال کی مختلف نظموں کو ایک مصری شاعر کے تعاون سے عربی میں منظوم ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں وہ جامعۂ مصر قاہرہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔"[۱]

(۳)-سر عبد القادر (جنھوں نے کلیاتِ اقبال کا مقدمہ لکھا ہے) آپ کے تعارف میں رقم طراز ہیں:

"پروفیسر محمد حسن الاعظمی صاحب ہمارے ملک کے ان چیدہ اصحاب میں سے ہیں جن کی شہرت وطن کی حدود سے بڑھ کر دور دراز بیرون ملکوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ اعظم گڑھ (یوپی) کے رہنے والے ہیں، ہندوستان میں علومِ مشرقی کی تحصیل کے بعد شوقِ علم انھیں کشاں کشاں مصر کو لے گیا، وہاں وہ جامعہ ازہر میں مدارجِ علمی طے کرتے ہوئے قاہرہ کی مشہور مصری یونیورسٹی کے پروفیسر ہوگئے۔"[۲]

(۴)-محمد رزق المصری آپ کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"والأستاذ الشيخ محمد حسن الأعظمي شديد الذكاء قوي الإرداة، جري قوي الإيمان شديد الذكاء بنفسه كاتب خطيب من أكب دعاة الجامعة الإسلامية الحقة ولما ذهب إلىٰ مصر و انخرط في سلك الطلبة بالجامع الأزهر الشريف ورأي بفراسته أن تربة مصر هي التربة التي يرجوها لتحقيق دعوة الوحدة الإسلامية أخذ يبث دعوته بين الطلبة والعلماء فأجابوه و تعرف بالعظماء والوزراء فأحبوه وأجلّوه فلمّا استوثق من النجاح دعا (وهو ذٰلك الطالب الهندي) إلى تاليف جمعية باسم الأخوة الإسلامية فتأفت برياسة الأستاد الجليل

(۱)-عظیم مصر، از: حسن الاعظمی، تعارف از کرنل عطاء الرحیم، ص:۱۵، کراچی، اپریل ۱۹۸۱ء۔
(۲)-اللآلی الاسلامیۃ الغالیہ من افکارِ اقبال وسعدی العالیۃ، تعارف از سر عبد القادر، ص:۹۔

الدكتور عبد الوهاب بك عزّام الأستاذ بالجامعة المصرية و رئيس القسم الشرقي فيها و سرعان ما انضم إليها فطاحل العلماء والوزراء كالمرحوم الأستاذ الشيخ طنطاوي جوهري و فضيلة الشيخ صاحب المعالي مصطفىٰ باشا عبد الرزاق و كان هذا وزيراً الأوقاف فمنح الجمعية مكانًا له عذمته في وسط القاهرة فعظمت الجمعيّة و انتخب أعضاؤها الأستاذ الأعظمي سكريتري عامّا فإذا ذهبت إلىٰ مقر الجمعية ترى جمعية الأقوام الإسلامية التي تضم المصري والهندي والصيني والجاوي والتركي وغيرهم من سائرِ الأقطار الإسلامية وكلهم كأسرة واحدة. الأمر الذي كام يسعى إلى تحقيقه السيد جمال الدين الأفغاني ولم يتحقق الأعلىٰ يدهذا الأزهري الهندي الشيخ الأعظمي ثم مَا ذا ؟ طمح الشيخ الأعظمي إلى شئ له قيمته فسعى سعيا حثيثا بمساعدة من عرفهم من العلماء والأدباء حتى جعل اللغة الأردية من اللغات التي تدرس بالجامعة المصرية التى عينه أستاذًا لهذه اللغة وأٰدابها ولهذا أزداد تصاله بأستاذة الجامعة مثل الأستاذ الدكتور طٰهٰ حسين بك والأستاذ عبد الحميد عبادي والأستاذ الدكتور حسن إبراهيم وغيرهم كثير من الذين عرفوا نبوغه فأحبّوه وأجلوه وقد أخذ عنه اللغة الأردية الأستاذ الدكتور عبد الوهاب عزام والأستاذ الصاوي شعلان الذى حوّل الأشعار الاداريّة فى الحياة الأردية والموت إلى اللغة العربية.

نال الأستاذ الأعظمي، شهادة العالمية من الجامعة الأزهرية بتفوق

غبظه أهل اللسان العربي عليه، وله مؤلفات شتى بعضها موضوع و بعضها مترجم منها ماتمّ طبعه ومنها ماهر تحت الطبع، كما أن بعضها بالعربية والأردية وبعضها بالعربية مثل شرح ديوان الأمير تميم الفاطمي، وبحث في الشيعة ومحاضرات عن مصر، والقرآءة الأعظمية والمكالمة الأعظمية و جامع القواعد و مدرس العربية ومبادئ اللغة العربية والرسائل الأعظمية والمعجم الأعظم وفتى الهند وغيرها.

ولا يتكلم الا باللغة العربية الفصيحة التي تطاوعة ألفاظها وتأتي إليه طائعة معانيها. يؤتى الحكمة من يشاء ومن يوت الحكمة فقد أوتي خيرًا كثيرًا. هذا ويحس بناقيل أن نختم هٰذه العجالة أن ننوه بما تضمنّته فلسفة الحياة والموت لا سيما اثناء هذهِ الحرب الطاحنة من أن ذٰلك سيفيد المسلمين عموماً و شبانهم خصوصًا وقد شعر بهد اطلاب الأزهر من الأقطار الإسلامية فترجموا إلىٰ لغاتهم المختلفة ونشروها في جميع انحاء العالم الإسلامى، وهذا ولا شك سيكون سبباً في توثيق عرى الوئام بين المسلمين جميعا. ولعل هذا الكتاب هو الأول في بابه من أبه جاء للمسلمين كانةٌ وخلدّ ذكر منشئه وهو الدكتور المرحوم محمد اقبال ونرجو أن ينسبح كثير من إخواننا المسلمين خصوصًا المصريين علىٰ منواله، حتى يتم الأخاء بين الجميع ويصح المسلمون مع بُعد الشقة كأسرة واحدةً إذا تألم عضومنها تألم لاجله بقية الأعضاء نسأل الله أن يجزى السبب في بث هذا المبدأ السامي بيننا وهو فضيلة الأستاذ الشيخ محمد حسن الأعظمي،

سدد الله خطاه و أبلغه ما يتمناه انه قريبٌ مجيب.''[۱]

درج بالا عربی تحریر کا ماحصل درج ذیل ہے:

''شیخ محمد حسن اعظمی ایک ذہین وفطین، پرعزم، قوی الایمان ادیب وقلم کار، خطیب، خود اعتمادی کے پیکر اور ایک عظیم داعی ومصلح تھے۔ بغرضِ تعلیم جامعہ ازہر مصر گئے اور وہاں اعلیٰ و ارفع مقام سے سرفراز کیے گئے۔ انھوں نے دورانِ تعلیم اپنی ذہانت وفراست سے اس حقیقت کا اندازہ لگا لیا تھا کہ مصر کی سرزمین وحدتِ اسلامی کی دعوت وتبلیغ کے لیے نہایت موثر اور موزوں ریاست ہے۔

استاد حسن الاعظمی اس مقصدِ خیر میں پورے انہماک اور توجہ سے جُٹ گئے۔ علما اور طلبہ میں اپنی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور بڑی حد تک کامیاب رہے۔ مصر کے علما و طلبہ اور عوام و خواص نے آپ کا ساتھ دیا۔ مصر کے حکمراں طبقہ اور وزرا نے تکریم اور حوصلہ افزائی کی اور اعظمی صاحب کے علمی وفنی کمال کے معترف ہوئے۔ شیخ حسن اعظمی نے تبلیغی مشن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ''اخوتِ اسلامی'' کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ پروفیسر عبد الوہاب بک عزام استاذ جامع ازہر مصر، شیخ طنطاوی جوہری، شیخ مصطفےٰ عبد الرزاق پاشا، وزیرِ اوقاف مصر وغیرہ کی سرپرستی میں یہ کمیٹی کام کرتی رہی۔ کمیٹی کے ارکان کی جانب سے حسن اعظمی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ کمیٹی کے توسط سے اعظمی صاحب پورے مصر میں چھا گئے اور پورے ملک میں عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اعظمی صاحب کی محنت رنگ لائی اور اس کمیٹی نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام کیا اور ان سب کی حیثیت ایک قبیلہ و خاندان کی سی ہو گئی۔ حسن اعظمی نے علما و ادبا کے تعاون سے مصر میں بڑی اہم اور قیمتی خدمات انجام دیں۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جامع ازہر مصر میں اردو زبان کو تدریسی

---

(۱)- اللآلی الاسلامیۃ الغالیۃ من افکارِ اقبال وسعدی العالیۃ، مقدمہ از: رزق المصری، ص: ۱۴-۱۶

حیثیت دی گئی۔ اور خود اعظمیؔ صاحب اردو کے استاذ مقرر ہوئے۔ اساتذۂ جامعہ ازہر میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین بکؔ، استاد عبدالحمید عبادیؔ، استاذ احمد امینؔ، ڈاکٹر حسن ابراہیمؔ جیسے علم و فضل میں یگانۂ روزگار افراد کا حسن اعظمیؔ ہی کی توسط سے اردو زبان سے رابطہ ہوا۔ ڈاکٹر عبد الوہاب عزامؔ اور استاد صاوی شعلانؔ نے حسن الاعظمیؔ صاحب ہی سے اردو زبان کی تعلیم حاصل کی۔

شیخ حسن الاعظمیؔ نے جامع ازہر مصر سے عالمیت کی ڈگری اعلیٰ پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ اعظمی صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم بھی ہیں بعض کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں، جب کہ بعض تصانیف زیرِ طبع ہیں۔ عربی اور اردو ہر دو زبان میں آپ کو مہارت حاصل ہے اور دونوں زبانوں میں آپ کی تالیفات موجود ہیں۔

شرح ديوان الامير تميم فاطمی، بحث فی الشيعة، محاضرات عن مصر، قراءة الاعظميه، مكالمة الاعظميه، جامع القواعد، مدرس العربية، مبادی اللغة العربية، الرسائل الاعظمية، المعجم الاعظم اور فتی الهند وغیرہ آپ کی مشہور عربی کتابیں ہیں۔

آپ بڑی اچھی اور فصیح عربی بولتے تھے۔ آپ کی عربی تقریر الفاظ و معانی کا گنجینہ ہوا کرتی تھی۔ [1]

(۵)-مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علمائے مبارک پور کے تصنیفی کارناموں کے حوالے سے اپنی کتاب "تذکرہ علمائے مبارک پور" میں لکھتے ہیں:

"اس ضلع میں بہت سے مردم خیز قصبات و دیہات ہیں۔ مگر کسی ایک قصبہ میں اتنے زیادہ مصنف پیدا نہیں ہوئے، جتنے کہ مبارک پور اور سوادِ مبارک پور میں گزرے ہیں اور اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے ضلع کا تصنیفی سرمایہ

(۱)- اردو تلخیص از مولانا محمد طفیل احمد مصباحی، نائب ایڈیٹر ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور۔

ایک پلّے پر رکھا جائے اور علماے مبارک پور کے تصنیفی کارنامے دوسرے پلے پر رکھے جائیں تو ان کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ یہاں کے علما میں تدریس وتعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا خاص ذوق رہا ہے جو دوسرے مقامات کے اہلِ علم سے ان کو ممتاز کرتا ہے، اس اعتبار سے ہم اس بستی کو بجا طور پر ”نیسا پور ہند“ کہہ سکتے ہیں۔ حدیث، فقہ، علمِ کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیرت، رجال، سوانح، ادب، طب، مناظرہ، ہیئت وغیرہ کے موضوعات پر یہاں کے مصنفوں نے عربی، فارسی، اردو اور گجراتی زبانوں میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی متعدّد عربی تصانیف ہندوستان سے گزرکر پورے بلادِ عرب بلکہ عالمِ اسلام میں مقبول ہوئیں اور اہلِ علم اپنی تصانیف میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔“[1]

آگے مزید لکھتے ہیں:

”استاد محمد حسن الاعظمی مبارک پوری ازہری کی بہت سی عربی تصانیف قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوئی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں حکومتِ مصر نے جامع ازہر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر مشہور فاطمی حاکم ”امیر تمیم“ کا دیوان شائع ہوا۔ ان ہی کی جدوجہد سے شاہ فاروق کے دور میں جامع ازہر میں پہلی بار اردو زبان کی تعلیم جاری ہوئی اور وہی اس کے پہلے معلّم ہوئے۔“[2]

(٦)- مشہور عربی اسکالر ڈاکٹر عبد الوہاب عزّام حسن الاعظمی کی کتاب ”عظیم مصر“ کی اشاعت پر پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں:

”جن لوگوں نے مصر پر اپنی خاص توجہ صَرف کی، وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ان کے مسائل سے دل چسپی کا اظہار کیا، اس کے لیڈروں کی سیرت اور اس کے خاص خاص

(۱)- تذکرہ علماے مبارک پور، از: قاضی اطہر مبارک پوری، ص: ۹۴۔
(۲)- حوالۂ سابق، ص: ۹۶۔

حادثات کے بارے میں کتابیں لکھیں، پروفیسر حسن الاعظمیؒ موسس "موتمر عالم اسلامی مرکزی" ومعتمد "پاکستان عرب کلچرل ایسوسی ایشن" ان میں ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں۔ جنھوں نے مصر کے بارے میں اپنی کتاب "آزاد مصر" اور "آج کا مصر" شائع کرائی، جس کو پڑھ کر سیکڑوں قارئینِ اردو مستفید ہوئے، اور اب وہ ان کا نیا ایڈیشن پہلی کتابوں میں کئی ابواب کا اضافہ کرنے کے بعد جن میں مختلف بڑے بڑے حادثات اور ان تبدیلیوں کا ذکر ہے جو مصر میں مذکورہ کتاب کی اشاعت کے بعد ظہور میں آئے، بنام "انقلابِ مصر" شائع کر رہے ہیں۔ ہم ان کی اس جاں فشانی کے بے حد شکرگزار ہیں۔"[1]

(۷)- حسن الاعظمیؒ علامہ اقبالؔ کے زبردست شیدائی تھے۔ اقبالؔ کو عرب دنیا میں متعارف کرانے والوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس حوالے سے **پروفیسر محسن عثمانی** ندوی اپنے مقالہ "اقبالؔ-تری آواز مکے اور مدینے" میں لکھتے ہیں:

"حیدر آباد کی سرزمین کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ عرب دنیا میں اقبالؔ کے باقاعدہ تعارف کا کام یہیں سے شروع ہوا۔ اقبالؔ کے بارے میں عربی زبان میں پہلی کتاب حیدر آباد میں لکھی گئی۔ یہ پہلی کتاب "فلسفة الحياة والموت فى شعر اقبال" ۱۹۴۶ء میں مرکزی بزمِ اقبالؔ حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔ یہ ڈاکٹر رضی الدین کا مقالہ تھا جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ کتاب کا ترجمہ حسن الاعظمیؒ صاحب نے کیا تھا۔ انھوں نے جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی اور جب مصر کی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہوا تھا تو وہ اس کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔

(۱)- عظیم مصر، از: حسن الاعظمی، پیش لفظ از عبدالوہاب عزا، ص:۸، کراچی ۱۹۸۱ء۔

علمی و تصنیفی خدمات:

آپ کثیر التصانیف شخص کی حیثیت سے معروف ہیں، بتایا جاتا ہے کہ آپ کی سو سے زائد تصانیف ہیں۔ آپ کی سو کتب کو جب ناشرینِ برِصغیر و قاہرہ و بیروت و دمشق اور حکومتِ مصر و پاکستان نے شائع کر دیا تو عالمی تنظیم "اتحاد العالم الاسلامی" کے سالانہ جلسہ میں متفقہ طور سے "باباے عربی" کا خطاب دیا گیا۔

آپ کی چند کتابوں اور علمی کارناموں کا تعارف حسب ذیل ہے۔

(ا)-فلسفۃ الحیاۃ والموت فی شعر اقبال:

اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اقبال کے جو اشعار فارسی یا اردو میں تھے اس کا عربی منظوم ترجمہ مصر کے شاعر صاوی شعلان نے کیا تھا مصر کے ممتاز ادیب اور شاعر صاوی شعلانؔ اور عبد الوہاب عزامؔ نے ڈاکٹر حسن اعظمیؔ سے اردو سیکھی تھی۔ یہ اقبالؔ کا اولین نقش تھا جو عرب دنیا میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد قاہرہ میں ایک انجمن "الاخواۃ الاسلامیۃ" کے نام سے قائم ہوئی جس میں اقبالؔ کے بارے میں مختلف ادیبوں نے اپنے خطبات پیش کیے اور ملک کی مشہور ادبی شخصیتوں کے اقبالؔ کے بارے میں لکچر ہوئے۔ طٰہٰ حسینؔ اور عباس محمودؔ نقاد جیسے قادر الکلام ادیب اس بزم میں شریک ہوئے تھے۔ عربی زبان میں یہ پہلی کتاب جو اقبالؔ پر حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی وہ نواب حسن یار جنگ بہادر صدر مرکزی بزم اقبال کے پیش لفظ سے مزین ہے۔ تعارف مدیر رسالہ مخزن سر عبدؔ القادر کے قلم سے ہے۔ ابتدائیہ عربی کے شاعر و ادیب ڈاکٹر عبد الوہاب عزامؔ نے لکھا ہے جو ماہرِ اقبالیات سمجھے جاتے ہیں اور اقبالؔ پر متعدّد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقیؔ کا "الحائز بجائزۃ نوبول" یعنی نوبل انعام یافتہ لکھا ہے جو واقعہ کے خلاف ہے۔ اگرچہ وہ اس انعام کے حق دار تھے اور ان کا نام تجویز

بھی کیا گیا تھا۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔
(۲)-الفلسفۃ والثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند و پاکستان:
۱۹۵۰ء میں محمد حسن اعظمی اور صاوی شعلان کے اشتراک سے ایک دوسری کتاب "الفلسفة والثقافة الاسلامية فی الهند و باكستان" کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اسے قاہرہ کے مشہور ناشر "عیسیٰ البابی الحلبی" نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں برصغیر کی اسلامی ثقافت کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین کا تذکرہ اور تعارف بھی ہے اور اقبالؔ کی کئی نظموں مثلاً شکوہ، جوابِ شکوہ کا اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا ترجمہ بھی ہے۔ کتاب کا مقدمہ مشہور ادیب اور جامعہ قاہرہ کے پروفیسر امین الخولیؔ کے قلم سے ہے۔"[۱]
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں مع اضافہ دار الفکر بیروت نے شائع کیا۔
(۳)-الثقافۃ والرسالۃ اور مجلۃ الازہر کے لیے ترجمہ:
پروفیسر حسن الاعظمی ازہری لکھتے ہیں:
"دوسری جنگ عظیم کے دوران دنیائے اسلام کے سب سے بڑے ثقافتی شہر قاہرہ میں عربی کے مشہور رسالہ "الثقافة والرسالة" اور "مجلة الازهر" وغیرہ کے لیے مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؔ کے بین الاسلامی تصورات سے لبریز اشعار کو میں نے نثر میں ترجمہ کیا، جسے جامعہ ازہر کے ممتاز شاعر و عالم استاذ صاوی علی شعلانؔ نے منظوم کیا، جنھیں مقالات کی شکل میں شائع کر کے علامہ سے عربی و اسلامی دنیا کے علما و ادبا کو متعارف کرایا گیا تھا۔ اس سے قبل ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۷ء سے اردو کا کلام سب سے پہلے ہم نے ہی منثور و منظوم ترجمہ پیش کیا تھا۔ جو عالمی تنظیم "جماعۃ الاخوۃ الاسلامیہ" کے ثقافتی اجلاس میں بڑی دل چسپی سے سنے جاتے تھے اور نمائندگان عالم کے ذریعہ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئے تھے۔ اس تنظیم کا مرکز بہ مشورۂ قائداعظم (محمد علی جناح) ۱۹۴۸ء میں کراچی منتقل کیا گیا اور ۱۹۴۹ء کے عالمی اجلاس کے موقع پر مصلحتاً نام بدل کر "موتمر العالم

(۱)-ماہ نامہ امکان لکھنؤ، نومبر دسمبر ۲۰۱۲ء، ص:۱۱، ۱۲۔

الاسلامی" اختیار کر لیا گیا تھا۔ پھر بعد میں اسے "اتحاد العالم الاسلامی" کے نام سے رجسٹرڈ کروالیا گیا ہے۔ اس کے سابق صدور میں مرحوم مفسرِ اعظم شیخ طنطاوی جوہریؒ، ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ سفیر متعیّنہ پاکستان، علامہ نواب رشید مکیؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ شامل ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے اکتیسویں سال کی صدارتی ذمہ داری جناب آفتابؒ اقبال صاحب فرزندِ اکبر علامہ اقبالؒ کے سپرد کی گئی تھی، جن کے انتقال پر ملا کے بعد بطور ساتویں اعزازی صدر کی خدمت کا میں ذمہ دار ہوں۔"(۱)

(۴)-اقبال کا فلسفۂ حیات وموت:

حسن الاعظمی کی یہ کتاب "بزمِ اقبال" حیدر آباد دکن نے عربی اور اردو میں شائع کی، پھر اس کے دوسرے ایڈیشن میں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" اور ان دونوں کے منتخب اشعار کا اضافہ کیا گیا، جنھیں مطربۂ مشرق سیدہ امِ کلثومؒ نے ۴رمئی ۱۹۶۷ء کے ایک جشنِ موسیقی میں پیش کیا اور اس کے دس ہزار ریکارڈ بنوا کر اسے باذوق حضرات تک پہنچایا۔ اس ریکارڈ کو عرب اور اسلامی ممالک کے ریڈیو اور ٹی وی سے متعدّد بار نشر کیا گیا۔ اس صلے میں حکومتِ پاکستان نے سیدہ امِ کلثومؒ کو ۱۹۶۷ء کے "تمغۂ امتیاز" سے نوازا اور استاد صاوی شعلانؒ کو ایک سال کی دعوت پر پاکستان بلایا تاکہ مزید ترجمہ کرسکیں۔

اس کتاب کی دوسری اشاعت ۱۹۶۹ء میں "الازہر پرنٹرس اینڈ پبلشرز کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ، کراچی" سے ہوئی۔ یہ کتاب کمیاب ہے۔ اس کے چند نسخے کچھ لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اقبال اکیڈمی لاہور، پاکستان میں آپ کی یہ کتاب اور چند ایک دوسری کتابیں محفوظ ہیں۔

سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

حسن الاعظمیؒ نے اس کتاب میں اقبال مرحوم کا فلسفۂ حیات وموت وضاحت سے اور بہت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کی یہ عجیب صفت ہے کہ یہ عربی میں بھی ہے اور اردو میں بھی، نظم میں بھی ہے اور نثر میں بھی۔ اس کے عربی حصۂ نظم ونثر کی داد تو

(۱)-الآلی الاسلامیۃ الغالیہ من افکار اقبالؒ وسعدی العالیہ، ص:۷

اہلِ زبان ہی دے سکتے ہیں، مگر اس کی سلاست کی بابت اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہم کم علموں کو بھی عربی حصہ کا مطلب سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

ایک اور چیز جو اس ترجمہ کو دیکھ کر نظر آئی وہ یہ ہے کہ کئی جگہ اردو میں جو مطلب اقبالؔ نے ایک شعر میں ادا کیا ہے، اس مطلب کو پوری طرح ادا کرنے میں عربی کے ناظم صاوی شعلانؔ کو دو شعر کہنے پڑے ہیں۔ سچ ہے کہ اردو میں دقیق مطالب کو عمدگی سے ادا کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور وہ قدیم اور زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کی خوبیاں پیدا کر رہی ہے، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ بعض اوقات اختصار کے لحاظ سے اردو اُن سے بازی لے جا سکتی ہے، بشرطے کہ لکھنے والا ایسا باکمال ہو جیسے ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم تھے۔

شیخ صاوی شعلانؔ کے اشعار کے متعلق یہ اعتراف واجب ہے کہ وہ اردو اور فارسی اشعار کے مطالب کو صحیح طور پر ادا کرنے میں اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

کلامِ اقبالؔ کے کئی حصے انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں، لیکن دنیاے اسلام کے اہم ترین حصص عربی بولنے والی قوموں سے پُر ہیں، اس لیے ان تک اقبالؔ کے پیغامِ حیات کو پہنچنا بہت امید افزا ہے۔"

اقبال کے "ترانۂ ملی" کا منظوم عربی ترجمہ بھی اس کتاب میں درج کیا گیا ہے، یہ ترجمہ نہایت دل کش ہے۔ ان کے ملکی اور ملی ترانے دونوں اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ ملکی ترانہ لکھنے کا خیال سب سے پہلے سر عبد القادرؔ نے ان کے سامنے پیش کیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ جیسے انگریزوں کا نیشنل گیت ہر موقع پر گایا جاتا ہے ایسی کوئی نظم ہمارے ہندوستان کے لیے بھی ہونی چاہیے، وہ سنتے ہی سوچنے لگے اور ان کی زبان سے یہ مصرعہ نکلا۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

سر عبد القادرؔ نے اسے بہت پسند کیا اور کہا، اب اس نظم کو مکمل کر دیجیے۔ ایک دو دن بعد وہ نظم مکمل ہو گئی، اور اس قدر مقبول ہوئی کہ کوئی نیشنل مجمع ایسا نہ تھا جس میں وہ قومی نظم پیش نہ کی گئی ہو اور اس کی مقبولیت کو دیکھ کر بعض دوستوں کو یہ خیال آیا کہ اقبالؔ سے کہیں کہ جیسا گیت انھوں نے ہندوستان کے لیے لکھا ہے، ویسا ہی دنیاے اسلام کے

لیے لکھا جائے۔ اقبال کے لیے یہ تجویز اور بھی دل پذیر ثابت ہوئی اور ترانۂ ملی بھی نظم ہو گیا، جس کا مطلع ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بقول سر عبدالقادر: معلوم نہیں ان دو مصرعوں میں کتنی تاثیر ہے کہ یہ شعر اب بیرون ممالک میں جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں، مقبول ہو چکا ہے۔

نیز دیکھیے یہ شعر لباسِ عربی میں کس خوب صورتی سے سجایا گیا ہے۔

اَلصِّيْنُ لَنَا وَالعَرَبُ لَنَــا وَالهِنْدُ لَنَا وَالكُلُّ لَنَــا
أضحى الإسلامُ لَنا دينًا وَجَمِيْعُ الكَونِ لَنَا وَطَنَا

عربی کے استاذ نے بحر بھی خوب چنی ہے جو فوجی بینڈ کے ساتھ نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔مصر اور عراق کے بعض مدارس میں لڑکے جھوم جھوم کر یہ ترانہ پڑھتے ہیں اور یہ عالمگیر جماعت "الاخوۃ الاسلامیۃ" قاہرہ کا خاص ترانہ مقرر کیا گیا ہے جو تقریبًا تمام دنیاے اسلام میں منتشر ہو چکا ہے۔

ان چار مصرعوں میں جو عربی ترجمہ سے نقل کیے گئے ہیں، اردو کے دو مصرعوں میں سمایا ہے۔لیکن ازراہِ انصاف ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ چھوٹی بحر کی وجہ سے دو مصرعوں سے کام نہیں نکلتا تھا اور ساتھ ہی اس آزاد ترجمہ میں ایک دو خوبیاں اردو سے بڑھ کر پیدا کی گئی ہیں، مثلاً "وَالكُلُّ لَنَــا" نے اس مصرعہ کے مضمون کو بلند تر کر دیا ہے۔اور "أضحى الإسلامُ لَنا دينًا" میں بھی ایک شان ہے جو اردو میں اس قدر خوب صورتی سے ادا نہیں ہوئی تھی، گو ہندوستان کے شاعر نے "مسلم ہیں ہم" کہتے ہوئے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

ذیل میں ہم یہ مکمل نظم، جس کا عربی عنوان "النشید الاسلامی" یعنی "اسلامی ترانہ" ہے مع اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

النشید الاسلامی

(۱)

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اَلصِّیْنُ لَنَا وَالعَرَبُ لَنَـا   وَالهِنْدُ لَنَا وَالکُلُّ لَنَـا
أضحی الإسلامُ لَنا دینًا   وَجَمِیْعُ الکَونِ لَنَا وَطَنَا

(۲)

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

تَوْحِیْدُ اللهِ لَنَـا نُوْرٌ   اَعْدَدْنَا الرُّوحَ لَهُ سَکَنَا
اَلکَوْنُ یَزُوْلُ وَلَا تُمْحٰی   فِی الدَّهْرِ صَحَائِفُ سُوْدَدِنَا

(۳)

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

بُنِیَتْ فِی الاَرْضِ مَعَبِدُهَا   وَالبَیْتُ الأوَّلُ کَعْبَتُنَا
هُوَ اَوَّلُ بَیْتٍ نَحْفَظُهُ   بِحَیَاةِ الرُّوْحِ وَیَحْفَظُنَا

(۴)

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

فِیْ ظِلِّ السَّیْفِ تَرَبَّیْنَا   وَبَنَیْنَا العِزَّ لِدَوْلَتِنَا
عَلَمُ الإسْلَامِ عَلَی الأیَّا۔   ـمِ شِعَارُ المَجْدِ لِمِلَّتِنَا
بِـهِلَالِ النَّصْرِ یُضِیءُ لَنَا   وَیُمَثِّلُ خَنْجَرَ سَطوَتِنَا

(۵)

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

وَاَذَانَ المُسْلِمِ كَـــانَ لَهٗ فِي الغَرْبِ صَدًى مِنْ هِمَّتِنَا

(٦)

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

قُوْلُوْا لِسَمَاءِ الكَوْنِ لَقَدْ طَاوَلنَا النَّجْمَ بِرِفـعَــتِنَا
يَا دَهْرُ لَقَدْ جَـرَّبْتَ عَلٰى نِيْرَانَ الشِّدَّةِ عَزَمَــتِــنَا
طُوْفَانُ البَاطِلِ لَمْ يُـغْرِقْ فِي الخَوْفِ سَفِيْنَةَ قُوَّتِــنَا

(٧)

اے گلستانِ اندلس، وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

يَا ظَلَّ حَدَائِــقِ اَنْدَلُسٍ اَنَسِيْتَ مَغَانِيَ عِــشْرَتِنَا
وَعَلٰى اَغصَانِكِ اَوْ كَانَ عَمُرَتْ بِطَلَا ئِع نَشَأَتِنَا

(٨)

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

يَا دَجْلَتُ هَلْ سَجَّلْتَ عَلٰى شَطَّيْكَ مَآثِرَ عِــزَّتِــــنَا
اَمْوَاجُكَ تَرْوِىْ لِلدُّنْــيَا وَتُعِيْدُ جَوَاهِرَ سِيرَتِــــنَا

(٩)

اے ارضِ پاک تیری حُرمت پہ کٹ مَرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

يَا اَرْضَ النُّوْرِ مِنَ الحَرَمَيْـــــنِ وَيَا مِيْلَادَ شَرِيْعَتِنَا
رَوْضُ الاِسْــلَامَ وَدَوْحَتُهُ فِيْ اَرْضِكِ رَوَّاهَـــا دَمُنَا

(۱۰)

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اِس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
وَمُحَمَّدُ كَانَ اَمِيْرَ الرَّكْـــبِ يَقُوْدُ الْفَوْجَ لِنُصْرَتِنَا
اِنَّ اسْمَ مُحَمَّدِ نِ الهَـادِيْ رُوْحُ الآمَالِ لِنَهْضَـــتِنَا

(۱۱)

اقبالؔ کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا
دَوَّتْ اُنْشُودَةُ اِقْـــبَالٍ جَرَسًا اَيْقَظَ فِيْهِ الزَّمَنَا
لِيُعِيْدَ قَـــوَافِلَنَا الاُوْلىٰ فِى المَجْدِ وَيَجُدُ وَ اُمَّتَنَا

صاویؔ شعلانؔ و محمد حسن اعظمی کی ترجمہ کردہ یہ نظم پنجاب ٹیکسٹ بورڈ لاہور کی عربی کی دوسری کتاب برائے جماعتِ ہفتم میں بھی شامل ہے۔

سر عبدالقادر چیف جسٹس بہاول پور سابق مدیر رسالہ ”مخزن“ مزید فرماتے ہیں:

یہ کتاب اپنے طرز کی ایک نرالی چیز ہے، یہی وجہ ہے کہ برّصغیر اور مصر دونوں ملکوں میں کتاب خاصی مقبول ہوئی۔ حتیٰ کہ جہاں کہیں بھی عربی بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں بھی علامہ اقبالؔ کے پیغام کا یہ حصہ اس کتاب کے ذریعہ پھیل گیا، جس میں کہا گیا ہے کہ یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے کہ وہ موت سے نہ ڈرے اور موت کو زندگی کی ایک آئندہ منزل کا راستہ سمجھے اور اس کا عمل یہ ہو کہ موت زیست، اور زیادہ پائدار زیست کا ذریعہ بنے۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی جوانی کے اردو کلام میں یہی بلند خیال ایک سہل ممتنع مصرعہ میں یوں ادا کیا تھا۔

”جسے مرنا نہیں آتا، اُسے جینا نہیں آتا“

(۵)-حدیث الروح:

علامہ اقبال کے "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کا اردو ترجمہ ہے، اسے ۱۹۷۰ء میں "سفارۃ پاکستان بالقاہرۃ" نے شائع کیا تھا۔

(۶)-اللآلی الاسلامیۃ الغالیہ من افکار اقبال وسعدی العالیہ:

یعنی اقبالؔ و سعدیؔ کے بلند اسلامی افکار (عربی اردو)۔ آپ کی یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں "الازہر کوآپریٹیو سوسائٹی کراچی" نے شائع کی۔

(۷)-المعجم الاعظم:

لغتِ عربی کے متعلق آپ نے متعدّد اہم کتابیں لکھیں، جن میں "المعجم الاعظم" (عربی اردو لغات) پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ سب سے پہلے اسے "معارف الاسلامیہ حیدر آباد" نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا، پھر ۱۹۵۴ء میں "مکتبہ اعظمیہ، کراچی" نے شائع کیا۔ یہ کتاب ان دنوں ناپید ہے۔

(۸)-تاویل الدعائم:

امام المعزلدین اللہ کے قاضی القضاۃ النعمان کی تالیف ہے، اس پر حسن الاعظمیؔ نے تحقیقی کام کیا، سب سے پہلے یہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں اسے دار المعارف قاہرہ نے شائع کیا۔ ۱۹۹۵ء میں دار الادواء بیروت، لبنان نے شائع کیا۔ ۲۰۰۶ء میں اس کا جدید ایڈیشن الموسسۃ الأعلمی للمطبوعات بیروت سے شائع ہوا۔

(۹-۱۱)-عربی کی نصابی کتابیں:

ان مطبوعات کے علاوہ ہندوستانی مدارس میں عربی کو ہر دل عزیز بنانے کے لیے "القراءۃ العالیہ، المکالمۃ الاعظمیہ، اورمدرس العربیۃ" کے نام سے متعدّد کتابیں نصاب میں داخل کی گئیں۔

(۱۲-۱۵)-عظیم مصر:

حسن الاعظمیؔ کی یہ کتاب پہلی بار اپریل ۱۹۸۱ء میں عالمی تنظیم "اتحاد العالم الاسلامی" ۳۰۲، بہادر آباد کراچی ۵، سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۳۶۰ صفحات ہے۔ یہ کتاب اصل میں

مصنف کی تین کتابوں آج کا مصر، آزاد مصر اور انقلابی مصر کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب کی تالیف قبلِ تقسیمِ ہند شروع کی گئی تھی اور قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی مولف کو ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی میں اقامت اختیار کرنی پڑی اور یہاں ۱۹۴۷ء میں کل پاکستان انجمن اشاعتِ عربی و رابطۃ التالیف والترجمہ کی نشاۃ ثانیہ ۱۹۴۸ء میں عربی کالج و تحریکِ اخوت یا مؤتمر عالمِ اسلامی اور پاکستان عرب کلچرل ایسوسی ایشن و مسلم ورلڈ نیوز وغیرہ متعدّد تحریکوں میں انہماک کے سبب اس کتاب کی کما حقہٗ تکمیل نہ ہو سکی۔ لیکن ۱۹۴۹ء کے اواخر میں قاہرہ و اسکندریہ میں ساڑھے سات ماہ کا موقع پاتے ہی آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کتاب کو نئی معلومات کے ساتھ شائع کیا جائے، چناں چہ نئے مصری انقلاب نے مولف کو تحریک دی کہ مصرِ قدیم و مصرِ جدید کو یک جا کر کے "عظیم مصر" کے نام سے اس کتاب کو شائع کیا جائے۔

اس کتاب میں ۱۹۴۰ء سے تا انقلابِ مصر اور انقلاب کے بعد کے اہم واقعات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

(۱۶-۵۴)- حسن الاعظمی کی تقریباً چالیس کتب متعلقہ انشاء، خطوط نویسی، قواعد، گفتگو، حدیث و قرآن وغیرہ کو ناشرینِ برِصغیر نے شائع کیا، جن میں چار کتب کو بغیر استاد کے پڑھا جا سکتا ہے، جن کے اسما مندرجہ ذیل ہیں:

المكالمة الاعظميه ﴿عربی اردو﴾، مرشد العربية﴿اول، عربی اردو﴾، مرشد العربيه ﴿ثانی، عربی ، اردو﴾، المحادثة العامتة العربيه.

(۵۵-۷۱)- مذکورہ کتب کے علاوہ استاد حسن الاعظمی کی مندرجہ ذیل کتب بھی کافی اہم ہیں:

اردو عربی جامع لغات(تین حصے)، اردو عربی پاکٹ ڈکشنری (اردو عربی جامع لغات کا خلاصه)، الحقائق عز باكستان، ديوان تميم بن المعز الفاطمی، الحقائق الخفية عن الشيعة، أمة واحده و لغة واحدة.

مذکورہ بالا سات کتب کو مصری حکومت نے شائع کیا تھا۔

القائد الأعظم و قصة الباكستان(باتصوير)، جنة الارض

كشمير، فلسفة اقبال الاسلاميه (نثر و نظم)، فتى الهند (باتصوير)، حقيقة باكستان.

مذکورہ کتابوں کو ناشرینِ قاہرہ نے شائع کیا تھا۔

الوحدة فى الشرق، ديوان تميم بن المعز مع تاريخى مقدمه، كتاب الذخيرة، حقيقة القاديانيين و البهائيين، درر الحكايات والفكاهات.

درج بالا کتابیں ناشرینِ بیروت نے شائع کیں۔

اقبالؔ کے فلسفہ کے متعلق ایک کتاب "فلسفۂ اقبال" دمشق سے شائع ہوئی۔

حسن الاعظمی کی مطبوعہ کتب کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہے۔ عالمی تنظیم "اتحاد العالم الاسلامی" کے ۳۷ر ویں سالانہ اجلاس میں متفقہ طور پر مولف کو ۱۰۱ تالیفات و تراجم کی اشاعت کے بعد "بابائے عربی" کا خطاب دیا گیا تھا، جس کی تفصیل ہفتہ وار "نئی آواز" کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ ہم نے اپنے پاکستانی احباب کے ذریعہ ہفتہ وار نئی آواز کا مذکورہ شمارہ تلاش کرنے کی کافی کوشش کی لیکن دستیاب نہ ہوسکا۔

وفات:

بہت تلاش و جستجو کے باوجود آپ کی تاریخ وفات کا علم ہمیں نہیں ہوسکا۔

جن سے حسن الاعظمیؒ متاثر ہوئے اور جن لوگوں نے ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مدد کی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا اجمالی تذکرہ بھی درج کیا جائے۔ چناں چہ آئندہ صفحات میں شیخ جمال الدین افغانیؒ، شیخ محمد عبدہؒ، مہدیؒ سوڈانی، علامہ شیخ طنطاوی جوہریؒ، ڈاکٹر عبد الوہاب عزامؒ بک اور شیخ الصاوی علی شعلانؒ کے ضمنی تذکرے پیش کیے جاتے ہیں۔

شیخ جمال الدین افغانیؒ

جمال الدین افغانیؒ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو کینسر کے عارضہ میں ہوا۔ یہ پورا عہد جدید اسلامی تاریخ کا اہم ترین عہد تھا اور افغانیؒ اس عہد کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ برصغیر میں ایک طویل عرصے تک افغانیؒ مسلم ہیرو کی حیثیت ہی سے متعارف رہے ہیں۔ ابو الکلام آزادؒ (۱۸۸۸ء -۱۹۵۸ء) اور علامہ اقبالؒ (۱۸۷۷ء -۱۹۳۸ء) جیسے عالم ومفکر بھی افغانیؒ کے مداح رہے ہیں۔

فرائیڈے اسپیشل شمارہ ۹ تا ۱۵ مارچ ۲۰۱۲ء میں عالمِ اسلام میں بیداری کی تحریک کے اہم رہنما سید جمال الدین افغانیؒ کے بارے میں مولانا غلام رسول مہرؒ کا مضمون شائع کیا گیا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد جمال الدین افغانیؒ کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے

بارے میں کئی تحقیقات شائع ہوچکی ہیں۔ نوجوان صاحبِ قلم تنزیل الصدیقی الحسینی (پاکستان) نے نئی تحقیقات کے حوالے سے جمال الدین افغانی کی شخصیت پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ اسے ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء-۱۸۹۷ء) اسلامی تاریخ کے انتہائی غیر معمولی اور متاثر کن شخصیت کے حامل رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے دور کے تقریباً ہر بڑے اسلامی خطے میں اپنی جگہ بنائی اور وہاں کی سیاست و معاشرت پر اثرانداز ہوئے۔ جس سے ان کی صلاحیتوں کا بَر ملا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے ایران، افغانستان، ہندوستان، مصر اور خلافتِ عثمانیہ میں اپنا وقت گزارا۔ ہندوستان میں ان کا عرصۂ قیام بہت کم رہا۔ یہی وجہ رہی کہ یہاں کے اہلِ علم ان کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلوؤں سے اس قدر واقف نہیں۔ اسلامی ممالک میں صرف خطۂ حجاز ہی ان کے اثر و نفوذ سے محروم رہا۔ اسلامی خطوں کے علاوہ جمال الدین افغانی نے یورپ اور روس میں بھی کچھ عرصہ گزارا۔ وہ ایک متحرک شخصیت کے حامل تھے جہاں بھی گئے تحریک برپا کرتے گئے۔ ان کی شخصیت بڑی انقلابی تھی جس نے ایک بہت بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ انہیں جدید اتحاد عالم اسلامی کے نظریے کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ گیر بھی تھی اور اس کے پہلو ہمہ جہت بھی۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان عام طور پر انہیں ایک مصلح و مجدد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کے برعکس عالم عرب خصوصاً مصر کے راسخ العقیدہ علما ان کے شدید مخالف ہیں کیوں کہ جمال الدین افغانی کی زندگی کا بیش تر عملی حصہ بھی مصر ہی میں گزرا ہے۔ اسی طرح جو جدید تحقیقات خود جمال الدین افغانی کے خطوط اور نوشتوں کی صورت میں منظرِ شہود پر آئی ہیں اس سے بھی ان کی شخصیت کے کئی اہم مگر پوشیدہ اور گمشدہ پہلو نمایاں ہوئے ہیں۔ جدید تحقیقات کے نتیجے میں کئی چشم کشا انکشافات ہوئے ہیں۔ ذیل کے مضمون میں تصویر کے اسی دوسرے رُخ کو قارئین کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔

جمال الدین افغانی کے ایک تذکرہ نگار شیخ علی الوردی نے اپنی کتاب "لمحات اجتماعیۃ فی تاریخ العراق الحدیث" (۳/۳۱۳) میں لکھا ہے:

"افغانی کا لقب ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہونے کے ساتھ بدلتا رہا۔ ہم نے انہیں مصر و ترکی میں افغانی کا لاحقہ استعمال کرتے دیکھا۔ ایران میں وہ حسینی تھے۔ بعض اوراق جو ضائع ہونے سے بچ گئے ان سے ان کے دوسرے لاحقات بھی واضح ہوتے ہیں۔ مثلاً استنبولی، کابلی، روسی، طوسی اور اسد آبادی۔ لقب کی طرح ان کا لباس و حلیہ بھی اپنے مقام کی نوعیت کے اعتبار سے بدلتا رہا۔" پاک و ہند میں جمال الدین افغانی یا جمال الدین اسد آبادی کے نام سے معروف ہوئے۔ "العروۃ الوثقیٰ" میں مدیر "السیاسۃ" کی حیثیت سے ان کا نام "جمال الدین الحسینی الافغانی" مرقوم ہوتا تھا۔

خیر الدین زرکلی (۱۸۹۳ء-۱۹۷۶ء) نے "الاعلام" (۶/ ۱۶۹) میں لکھا ہے:

"ان کے ایک [نصرانی] مرید ادیب اسحاق کے زیر ادارت نکلنے والے جریدے "مصر" میں جمال الدین کی تحریریں "مظہر بن وضاح" کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔"

اس کے علاوہ جمال الدین افغانی جن لاحقوں سے معروف ہوئے ان میں جمال الدین استنبولی اور جمال الدین حسینی عبداللہ بن عبداللہ بھی ہے۔ (۱)

محمد مبارک نے اپنے مقالے "الفرسان الثلاثۃ" میں ان کا اصل نام آیت اللہ مازندرانی لکھا ہے۔ جمال الدین افغانی کی سوانح کا پہلا مرحلہ ان کی وطنیت اور خاندان کے حوالے سے متضاد بیانات کا حامل ہے۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:

"ان کے خاندان، مقام ولادت اور قومیت کے متعلق بہت الجھی ہوئی بحث ہمارے سامنے ہے، بہت سے متضاد بیانات ہیں۔ نفی اور اثبات کی ایک صبر آزما آویزش ہے جس سے بچ کر نکلنا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔" (۲)

(۱)- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "جمال الدین الافغانی" از ڈاکٹر علی عبدالحلیم محمود
(۲)- آثار جمال الدین افغانی: ۱

جمال الدین افغانی نے اپنی جائے ولادت ''اسد آباد'' بتائی ہے اور یہاں یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ ''اسد آباد'' ایران، افغانستان اور آذر بائیجان کے ۳۳ / مقامات کا نام ہے۔موصوف کے ایرانی الاصل ہونے کے سب سے بڑے مدعی مرزا لطف اللہ خاں ہیں جو خود کو جمال الدین افغانی کا بھانجا بتاتے ہیں۔ تاہم اس قضیے کے بارے میں ایک محقق نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ نہایت معنی خیز ہے۔ ملاحظہ ہو:

'' جمال الدین افغانی مختلف صلاحیتوں کی حامل ایک مذہبی شخصیت تھی، ایک محقق، فلسفی، مدرس، صحافی اور سیاستدان۔ وہ مغربی ایران میں ہمدان کے اطراف میں اسد آباد کے مقام پر ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تاہم انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کا مقام ولادت مشرقی افغانستان میں کنڑ کے قریب اسد آباد کا مقام ہے نیز ان کے والدین سنی تھے۔ انہوں نے سنی پسِ منظر کا دعویٰ اس لیے کیا تاکہ انھیں مخاطبین کا وسیع حلقہ مل سکے۔''(۱)

عمر رضا کحالہ نے اپنی مشہور کتاب ''معجم المولفین'' (۱۵۵/۳) میں ''أعلام الشیعة '' کے حوالے سے جمال الدین کی جاے ولادت اسد آباد ہمدان تحریر کیا ہے۔

اب آخر میں ''رابرٹ ڈریفس'' کا بیان ملاحظہ کیجیے:

'' ۱۸۳۸ء میں غالباً فارس میں جنم لینے والے جمال الدین نے خود کو افغانستان نژاد ظاہر کرنے کے لیے الافغانی کا لقب اپنایا۔ افغانی الاصل ہونے کا دعویٰ کرنے کے ذریعے وہ فارسی اور شیعہ ہونے کی دونوں شناختوں کو چھپانے کے قابل ہوئے تاکہ سنی اکثریتی مسلم دنیا میں وسیع تر پیمانے پر مقبولیت پا سکے۔ افغانی کی جائے پیدائش کے قریب اس کا پہلا بھیس موجود تھا۔ ممتاز برطانوی مستشرق ایلی کدوری (Eli Kedourie) کے مطابق افغانی کے پیرو کاروں (بشمول رشید رضا اور عبدہٗ) نے ''سچائی کی کفایت'' سے کام لیا۔ افغانی زندگی بھر بھیس بدلتے رہے۔ اگرچہ انھیں بجا طور پر ساری اسلامی دنیا پر محیط بین اسلامی سیاسی و

---

(۱)- Islamic Fundamentalism:49

سماجی تحریک کی نظری بنیادیں مہیا کرنے والا سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ ایک غیر راسخ العقیدہ مفکر تھے جو ایک فری میسن، صوفی، سیاسی کارکن اور سب سے بڑھ کر ایک ایسے شخص بھی تھے جو بقول کدوری " مذہب کے سماجی استحصال" پر یقین رکھتے تھے۔"(۱)

یہاں یہ ذکر بے محل نہیں کہ اکثر مستشرقین نے افغانی کے شیعہ وسنی ہونے کے بحث کو طول دیتے ہوئے انھیں شیعہ قرار دیا ہے۔سنی مورخین انھیں سنی اور شیعہ مورخین اسے شیعہ قرار دیتے رہے ہیں۔ جب کہ علی عبد الحلیم محمود (۱۹۱۰ء-۱۹۷۸ء) نے " جمال الدین الافغانی " (صفحہ ۶۸)،مصطفیٰ فوزی غزال نے " دعوة جمال الدین الافغانی فی میزان الاسلام "(ص ۸۰) اور محمد مبارک نے اپنے مقالے "الفرسان الثلاثة " میں قرائن سے اسے "بابی" ثابت کیا ہے۔ جب کہ یہ بات تو مشرق و مغرب کے اہلِ علم میں یکساں معروف ہے کہ وہ "فری میسن" تھے،اس کے بعد ان کے مسلکی انتساب کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔

"افغانی کو عربی، افغانی، فارسی سنسکرت، ترکی زبانوں پر مہارت تھی جب کہ فرانسیسی، انگریزی اور روسی بھی جانتے تھے۔ فصاحت کے ساتھ عربی زبان میں تکلم کا سلیقہ انہیں حاصل تھا۔"(۲)

افغانی کا فری میسن ہونا اب محتاجِ ثبوت نہیں رہا۔ان کے عقیدت مندوں نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ وہ "فری میسن" تھے۔ ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ وہ اطالوی لاج Luce De Orient کے ممبر بنے۔ ۱۸۷۷ء تا ۱۸۹۷ء انھوں نے مصر کی ماسونی تنظیموں (فری میسن) سے روابط استوار کیے۔بعض دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ افغانی نیل لاج قاہرہ کے بھی ممبر تھے جو نیشنل گرینڈ لاج مصر کے ماتحت چل رہی تھی۔ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ افغانی کوکب شرق لاج کے بھی ممبر بنے، یہ لاج برطانوی گرینڈ لاج

(۱)-اسلامی بنیاد پرستی کی تاریخ: ۱۴۰، ترجمہ یاسر جواد
(۲)-الاعلام: ۱۶۹/۶

کی منظوری سے قائم ہوئی تھی۔ مشہور مصری دانش ور محمد صابری کے بقول افغانی نے برطانوی قونصل مقیم قاہرہ رافیل بورگ کی ایما پر کوکب شرق لاج کی رکنیت اختیار کی تھی۔ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ افغانی نے ۲۴ ر جنوری ۱۸۷۷ء کو اس لاج کے ایک غیر معمولی اجلاس میں شرکت کی اور اگلے سال جنوری ۱۸۷۸ء میں انہیں اس لاج کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس سے خفیہ برطانوی اداروں سے ان کے روابط بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ ۳ ر فروری ۱۸۷۹ء کو گرینڈ لاج انگلینڈ کے تحت قائم گریشیا لاج کے ممبر بنے۔ افغانی چوں کہ کئی "فری میسن" لاجوں کے ممبر بنے اس لیے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مکمل علم نہیں ہوتا۔ (۱)

افغانی کا "فری میسنزی" سے تعلق اس قدر گہرا اور نمایاں ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں تاہم افغانی کے لیے نرم گوشہ رکھنے والوں نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ افغانی اصلاحی و تعمیری مقاصد کے لیے "فری میسن" بنے تھے اور وہ "فری میسنری" کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خیال رہے کہ "فری میسنز" اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ کوئی انہیں استعمال کرلے۔ اس کے برعکس وہ بڑی آسانی سے بڑی بڑی شخصیات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ بشیر احمد بھی افغانی کے ایسے ہی ہمدردوں میں سے ہیں مگر انھوں نے اپنی کتاب "فری میسنری" میں افغانی کے خلاف ثبوت زیادہ مہیا کیے ہیں اور اس کا دفاع انتہائی کمزور لہجے میں کیا ہے۔ وہ بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ:

" وہ ایک اعلیٰ درجے کے مستعد "فری میسن" تھے اور مصر کی "فری میسنری" سے ان کے قریبی روابط تھے۔" (ص ۲۳۵)

سلطان عبد الحمید (۱۸۴۲ء - ۱۹۱۸ء) جن کی بے گناہی تاریخ نے ثابت کردی ہے۔ استعمار کی بات نہ ماننے ہی کی بنا پر انہیں مسندِ خلافت سے دست بردار ہونا پڑا۔ جنہوں نے فلسطین کی ایک مشتِ خاک بھی یہودیوں کے حوالے کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ وہ بھی افغانی سے نالاں تھے۔ سلطان عبد الحمید کی ذاتی ڈائری شائع ہوچکی ہے۔ اس سے بھی افغانی

(۱)۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بشیر احمد کی کتاب " فری میسنری": ۲۳۴-۲۳۹

کی زندگی پر غیر معمولی روشنی پڑتی ہے اور بعض اہم حقائق ظاہر ہوتے ہیں۔ بشیر احمد نے اپنی کتاب '' فری میسنری '' میں سلطان عبدالحمید کی ڈائری کا ایک اقتباس نقل کیا ہے ملاحظہ ہو:

'' ان کے ہاتھ ایک منصوبہ لگا جو برطانوی وزارت خارجہ کے دفتر میں تیار ہوا تھا اس منصوبے میں دو آدمی بنیادی کردار کی حیثیت رکھتے تھے ایک جمال الدین افغانی اور ایک انگریز جو اپنا نام بلنٹ Blunt بتاتا تھا۔ منصوبے میں کہا گیا تھا کہ ترکوں سے خلافت کی قبا لے لی جائے اور مکہ کے شریف حسین کو مسلمانوں کا خلیفہ بنانے کا اعلان کیا جائے۔''(ص ۲۳۹)

سلطان عبدالحمید لکھتے ہیں:

'' میں جمال الدین افغانی کو قریب سے جانتا تھا جب وہ ۱۸۷۹ء میں مصر میں تھے۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھے مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے ایک بار انھوں نے میرے سامنے تجویز رکھی کہ وہ وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کو روس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرسکتے ہیں مجھے خوب علم تھا کہ افغانی ایسا کرنے پر قادر نہیں وہ انگریزوں کے آدمی تھے اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ انہیں انگریزوں نے میری جاسوسی کے لیے تیار کیا تھا میں نے فوراً انکار کر دیا میں نے ابوالہدیٰ الاصیادی الحلی کے ذریعے انہیں استنبول آنے کی دعوت دی اور پھر انھیں نکلنے نہ دیا اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔''

افغانی کی زندگی کا یہ پہلو نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ سیّد رشید رضا مصری کی کتاب ''تاریخ الاستاذ الامام '' میں بھی افغانی کی زندگی کے کئی اہم پہلو مذکور ہیں۔ راسخ العقیدہ علما نے اس کی سخت مخالفت کی ہے۔ علمائے ازہر نے افغانی کے الحاد پر متفقہ فتویٰ بھی دیا ہے۔ مفتیانِ کرام میں شیخ محمد بن احمد علیش مالکی (۱۸۰۲ء-۱۸۸۲ء) اور شیخ فہد الرومی نمایاں ہیں۔ موخرالذکر نے ''منهج المدرسة العقلية فى التفسير'' میں افغانی دبستانِ فکر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ شیخ مصطفیٰ صبری (۱۸۶۹ء-۱۹۵۴ء) نے '' موقف العقل والعلم والعالم من ربّ العالمين '' اور شیخ خلیل فوزی الفلیباوی نے '' السيوف القواطع '' میں افغانی پر سخت تنقید کی ہے۔ اس کے

علاوہ اس کے معاصر مخالف علما میں مفتی حنفیہ مصر شیخ محمد بخیت (۱۸۵۴ء-۱۹۳۵ء) اور شیخ حسن فہمی کا نام بھی ملتا ہے۔ زمانۂ حال کے ایک عرب عالم شیخ مقبل بن ہادی الوداعی (۱۳۵۱ھ-۱۴۲۲ھ) نے اپنے فتاویٰ " تحفة المجیب علی اسئلة الحاضر و الغریب" میں افغانی کو ائمۂ ضلال میں شمار کیا ہے۔ دوسری طرف جو تحقیقی ذخیرہ سامنے آیا اس سے بھی شکوک و شبہات بڑھتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں ایرج افشار اور ڈاکٹر اصغر مہدوی کی مساعی سے " مجموعہ اسناد و مدارک چاپ نشدۂ سید جمال الدین افغانی" تہران سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں افغانی کی وہ یادداشتیں ہیں جو قیام تہران کے دوران الحاج محمد حسین امین دارالضرب کے گھر رہ گئی تھیں۔ صاحبِ خانہ افغانی کے خاص احباب میں سے تھے۔ اس کے علاوہ پروفیسر نکی کیڈی Nikki Keddie استاد ادبیات ایران، کیلی فورنیا یونیورسٹی امریکا کی ایک اہم کتاب " Sayyid Jamal al-din al-Afghani: A Political Biography" یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس سے ۱۹۷۲ء میں منظرِ شہود پر آئی۔ اس میں بھی افغانی کے حوالے سے بعض اہم شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح افغانی کے بعض مذہبی و فلسفیانہ افکار و نظریات بھی انتہائی سخت ملحدانہ اندازِ فکر کے حامل ہیں، جنھیں طوالت کے خوف سے ترک کیا جارہا ہے۔[1]

(۱)- www.urduweb.org

مفتی محمد عبدہ مصری:

حسن الاعظمی لکھتے ہیں:

مقامِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں اور نہ ان کی تاریخِ پیدائش کا تعین ہو سکا ہے، ان کی تحریروں سے ۱۸۴۹ء سالِ پیدائش ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے تیراکی، گھوڑ سوارای اور نشانہ بازی میں مہارت حاصل کی، ان کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف جو آئندہ زندگی میں ظاہر ہوئے، وہ درحقیقت دیہاتی رسم و رواج اور قبائلی زندگی کی خصوصیات کے عکس تھے، مثلاً عوام کی ضروریات کا احساس، ان کی تکمیل کے لیے مخلصانہ سعی و عمل اور قومی زندگی کی اصلاح کا ولولہ وغیرہ۔ ان کے والدین اگرچہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن ان میں سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی ضرور تھی، نسبتاً فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس لیے ان کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا جو گھر پر لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا، جب دس سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تو انھیں ایک حافظ کے سپرد کر دیا گیا تاکہ قرآن مجید حفظ کرائیں، غریب طلبہ کے لیے یہی تعلیم ممکن تھی۔ جدید علوم کے مدارس کی تعداد بہت محدود تھی، جن میں صرف سرکاری عہدے داروں کے لڑکے شریک ہو سکتے تھے، اس بنیادی تعلیم کے بعد حفظِ قرآن کی تکمیل اور قراءت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کو تیرہ سال کی عمر میں طنطہ کی احمدی مسجد کے مدرسہ میں شریک کر دیا گیا۔ یہاں دو سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی صَرف و نحو کی ابتدا کرائی گئی، لیکن وہ بدقسمتی سے اس صبر آزما مشقت کو برداشت نہ کر سکے اور تعلیم سے برگشتہ ہو گئے۔

پھر ۱۸۶۵ء میں دوبارہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، اس کے ایک سال بعد ۱۸۶۶ء میں انھوں نے جامع ازہر میں داخلہ لیا۔ جس وقت محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کی چہار دیواری میں قدم رکھا اُس وقت ان کی شکل و صورت اور گفتار میں کوئی نمایاں خصوصیت

ایسی نہیں تھی جس کے سبب وہ ازہر کے اساتذہ کی نظروں میں ممتاز ہوجاتے، لیکن جلد ہی اپنی فطری استعداد، جودتِ طبع اور قوتِ فیصلہ سے انھوں نے اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کر لیا، چار سال تک جامع ازہر کے مقررہ نصاب کی تکمیل کی اور درس میں پابندی سے حاضر رہے۔ البتہ ایسی جماعتوں سے غائب رہتے جن میں شریک رہنے سے انھیں کوئی فائدہ معلوم نہ ہوتا تھا۔

۱۸۷۷ء میں جامعہ ازہر سے فراغت ہوئی پھر جلد ہی بحیثیت استاذ جامع ازہر ہی میں ان کی تقرری ہوگئی۔

ان کی آخری علالت کا سلسلہ ان کے ایک دوست محمد بے کے مکان سے شروع ہوا جہاں وہ اس زمانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ صاحب اسکندریہ کے قریب ایک قریہ میں سکونت پذیر تھے، ان کی علالت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ جمعرات کے روز ۱۱ر جولائی ۱۹۰۵ء کو انھوں نے اس عالمِ فانی کو الوداع کہا۔

قیادت و رہ نمائی کے لیے جتنی خصوصیات ضروری ہیں بلا شبہہ وہ سب محمد عبدہ کی ذات میں موجود تھیں، ان کی تقریر میں روانی و برجستگی ہوتی تھی اور ان کی زبان تحریر و تقریر دونوں میں فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ تھی، وہ غیر معمولی محنت و مشقت کے عادی تھے، نیز اعلیٰ درجہ کی عملی و انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے، مغربی علوم کی مختلف شاخوں سے بھی وہ کچھ کم واقفیت نہ رکھتے تھے، اگرچہ اس باب میں انھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ تراجم کے ذریعہ حاصل کیا، چالیس سال کی عمر میں انھوں نے فرانسیسی سیکھی تاکہ اس زبان کا علم انھیں براہِ راست ہوجائے، اس کے بعد وہ فرانسیسی زبان کی کتابوں کا مطالعہ لگاتار کرتے رہے، ان کی تصانیف کے ترجمے اکثر زبانوں میں ہوچکے ہیں اور بعض میں اب بھی ہو رہے ہیں۔ (بحوالہ عظیم مصر)

محمد احمد المعروف بہ مہدی سوڈانی

محمد احمد بن سید عبداللہ (پیدائش: ۱۲ اگست ۱۸۴۵ء، انتقال: ۲۲ جون ۱۸۸۵ء) سوڈان کی ایک معروف شخصیت ہیں جنہیں ملک میں تحریک اسلامی کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ انگریزوں اور مصریوں کی جارحیت کے خلاف جہاد اور شریعت اسلامی کے نفاذ کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔

ابتدائی زندگی: مصری حکمران محمد علی پاشا نے ۱۸۲۰ء میں نوبیہ اور اگلے سال سنار فتح کر لیا اور سوڈان پر مصری تسلط آہستہ آہستہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں استوائیہ یعنی موجودہ سوڈان کا انتہائی جنوبی حصہ بھی مصری سلطنت میں شامل ہو گیا۔

مصری حکومت نے سوڈانی باشندوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جس کا سوڈانیوں میں شدید ردعمل ہوا اور ۱۸۸۳ء میں انہوں نے ایک درویش صفت انسان محمد احمد کی رہنمائی میں علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ یہی محمد احمد مہدیؔ سوڈانی کہلاتے تھے۔ مہدیؔ سوڈانی کے پیروکار "درویشوں" نے دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ مصری حکومت نے بغاوت کچلنے کے لیے ایک انگریز فوجی جنرل گورڈنؔ کی خدمات حاصل کیں لیکن جنرل گورڈنؔ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس طرح ۲۶ ر جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہو گیا۔ مہدیؔ سوڈانی اب مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

مہدیؔ سوڈانی تاریخ اسلام کی ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی رہنما اور ایک حکومت کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ ایک مصلح بھی تھے۔ انہوں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی اور کہا جاتا ہے کہ وہیں ان کی ملاقات جمال الدین افغانیؔ سے بھی ہوئی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں۔ وہ تمام زندگی احکامِ اسلام کی سختی

سے پابندی کرتے رہے۔

۱۸۸۰ء میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد مہدیؔ سلسلہ سمانیہ کے سربراہ ہوگئے۔ انہوں نے کئی سال دریائے نیل کے ایک جزیرے "آبا" میں رہائش اختیار کی اور یہیں سے اپنی تحریک چلائی۔ یہ تحریک ۲۹ / جون ۱۸۸۱ء میں اس وقت شروع ہوئی جب مہدی نے سوڈان کے ممتاز لوگوں کو کتاب وسنت کی بالادستی قائم کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ اس مقصد کے لیے لوگوں کو جان و مال کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ پس اس کے بعد سوڈان کے مصری حکام اور مہدی کے حامیوں میں جھڑپیں شروع ہوگئیں جو بالآخر مہدی کی فتح پر ختم ہوئیں۔

مہدیؔ نے کامیابی حاصل کر کے نیل کے مغربی کنارے پر خرطوم کے بالمقابل ام درمان کے شہر کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دیں۔ نئے سکے ڈھالے گئے اور جن لوگوں کو سابق حکومت نے ناجائز طور پر زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا انھیں ان کی زمینیں واپس کر دی گئی۔ مہدیؔ سوڈانی نے اسلامی تعلیمات کے خلاف پھیلنے والی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی اور شراب و نشہ آور اشیا کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا۔ عورتوں کو پردے کی ہدایت کی گئی، شادی بیاہ پر فضول اخراجات سے روکا گیا اور جہیز پر پابندیاں عائد کی گئیں۔

انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروکاروں کو بدنام کرنے کی بڑی کوششیں کی حتیٰ کہ ۱۹۰۰ء میں جب سوڈان پر انگریزی و مصری قبضہ مکمل ہونے کے بعد انگریز حاکم لارڈ کچنرؔ نے جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر مہدیؔ کی قبر کھدوادی اور اس کی ہڈیاں جلاڈالیں۔

مہدی سوڈانی کو سوڈان کی تحریکِ بیداری کا پیش رو مانا جاتا ہے۔ ام درمان میں آپ کا مزار آج بھی سوڈانی مسلمانوں کی جائے عقیدت ہے۔ [1]

---

(۱)- بحوالہ: http://ur.wikipedia.org/wiki/

شیخ طنطاوی جوہریؒ

حسن الاعظمیؒ لکھتے ہیں:

آپ کی جائے پیدائش طنطہ ہے جو مصر کا ایک ضلع ہے ، یہیں پر مشہور ولی سید احمد بدویؒ کا مزار ہے، اسی مزار سے متّصل مدرسہ میں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے جامع ازہر مصر میں داخلہ لیا، فراغت کے بعد دار العلوم قاہرہ اور بعد ازاں جامع ازہر میں استاذ کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔

آپ نے اکثر رائج الوقت علوم میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کی مشہور سیاسی تصنیف "الاحلام فی السیاسة" کا ترجمہ یورپ اور مشرق کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آپ کی سب سے مشہور تصیف "تفسیر جوھری" ہے جو مع ضمیمہ ۲۶/ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، یہ پہلی باتصویر تفسیر ہے۔

آپ کی علمی قابلیت کی شہرت یورپ اور مشرق میں اس زمانہ کے علما سے زیادہ تھی، چناں چہ جب ترکستان کے مسلمانوں نے چین اور روس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنی آزاد حکومت قائم کی تو ایک جامعہ کی بنیاد بھی ڈالی اور وہاں کے علما نے اقتضائے زمانہ پر غور و خوض کرنے کے بعد علامہ جوہری کے طریق تدریس اور بتائے ہوئے نصاب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس کا نام جامعہ طنطاویہ رکھا۔

اوائل ۱۹۴۰ء میں آپ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ (بحوالہ عظیم مصر)

ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام:

کلام اقبالؔ کو عالم عرب میں متعارف کراونے والوں میں سب نمایاں نام ڈاکٹر عبد الوہاب عزّام (۲۸ اگست ۱۸۹۴ء - ۱۸ جنوری ۱۹۵۹ء) کا ہے ۔ آپ کا تعلق مصر کے ایک ایسے معروف گھرانے سے تھا جس میں ڈاکٹر، انجینئر، سفارت کار، ماہرینِ تعلیم، بیورو کریٹس وغیرہ بکثرت پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے جامعہ الازہر سے تکمیل تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے لندن کا سفر کیا اور یہاں وہ پہلی مرتبہ پیغام اقبالؔ سے آشنا ہوئے مگر یہ ابتدائی واقفیت جڑ نہ پکڑ سکی یہاں تک کہ آپ مصر لوٹ آئے، اور پہلے شعبۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور بعد ازاں سفارت کاری سے منسلک ہوگئے اور اس دوران پاکستان، یمن اور سعودی عرب میں بطور سفیر خدمات انجام دیں۔

۱۹۳۱ء میں مسجد اقصیٰ میں پہلی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر اسکندریہ کی "جمعية الشبان المسلمين" نے علامہ کے اعزاز میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا، اس موقع پر ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام نے اپنے استاد عبدالوہاب نجاؔر کے حکم پر حاضرین سے علامہ اقبالؔ کا تعارف کروایا۔

ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام کہتے ہیں کہ :

جب وہ لندن میں تھے تو انھوں نے اقبالؔ کا نام سنا تھا اور یورپی مجلّات میں ان کے بارے میں پڑھا تھا اس کے بعد انھوں نے "پیام مشرق" کا مطالعہ کیا اور اقبالؔ کے گرویدہ ہوگئے۔ اب وہ اپنی خلوت میں اقبالؔ کے بارے میں سوچتے تو اپنی جلوت میں ان کے فکر و فن پر گفتگو کرتے۔

۱۹۳۴ء میں انھوں نے ''اللمعات'' کے عنوان سے ایک نظم لکھنا شروع کی اور اس کا انتساب علامہ اقبالؔ کے نام کیا۔ عبدالوہاب عزامؔ کو عربی، فارسی، انگریزی اور ترکی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ فردوسیؔ پر انھوں نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ سپردِ قلم کرنے کے علاوہ فردوسیؔ کے مشہور زمانہ ''شاہنامہ'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔

اردو اور فارسی پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے انھوں نے اقبالؔ کے فکروفن کو مکمل طور سے سمجھا اور ''ضرب کلیم، پیام مشرق، اسرار خودی اور رموز بے خودی'' کا عربی میں منظوم ترجمہ کیا۔ '' ضرب کلیم ''علامہ اقبالؔ کی وفات سے ایک سال قبل ۱۹۳۷ء میں قاہرہ سے اور'' پیام مشرق'' ۱۹۵۰ء میں کراچی سے منظرعام پر آئی۔ اس کے بعد ''اسرار خودی اور رموزِ بے خودی'' کے منظوم عربی تراجم زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے۔ ''جاوید نامہ ''کی بھی چند نظموں کا انھوں نے عربی میں ترجمہ کیا۔ ''محمد اقبال سيرة و فلسفه و شعره''(علامہ اقبال حیات، فلسفہ اور شاعری) کے عنوان سے ایک کتاب بھی انہوں نے عربی میں تحریر کی۔ انہوں نے اقبال کے فکروفن پر سعودی ''مجله المنهل'' کا خصوصی شمارہ بھی شائع کروایا۔ آج بھی جب اقبالؔ کی شاعری کے عربی تراجم کا ذکر آتا ہے تو ڈاکٹر عزامؔ کے تراجم بنیادی حوالہ ہوتے ہیں۔

صاوی شعلانؔ

صاوی شعلانؔ (۱۹۰۲ء-۱۹۸۲ء) کا تعلق بھی دریائے نیل کی سرزمین سے ہے۔ الصاوی محمد علی شعلانؔ مصر کے وسطی صوبے کے ایک گاؤں "سبک الاحد" میں پیدا ہوئے، آپ نے بصارت سے محرومی کے باوجود کم سنی میں ہی قرآن کی تجوید و تحفیظ مکمل کی۔ آپ ۱۹۱۸ء میں جامعہ الازہر سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں اعلیٰ ثانوی ڈپلومہ حاصل کیا۔ بعد ازاں قاہرہ یونیورسٹی سے انگریزی، عربی اور اردو زبان کی تعلیم حاصل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد آپ نے متعدّد کالجز میں بحیثیت عربی زبان کے استاد کے خدمات انجام دیں۔ آپ مختلف فلاحی انجمنوں کے رکن ہونے کے علاوہ مذہبی اور ابلاغی کمیٹیوں کے سربراہ بھی رہے، ۱۹۳۴ء میں ریڈیو مصر کے شعبۂ مذہبی امور کے قیام پر آپ کو اس کے پہلے اسپیکر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ صاوی شعلانؔ ایک اسلام پسند اور محب وطن شاعر تھے آپ کے تین شعری مجموعے "پہلا پیغام، حکمت کے سوتے اور ایمان سے متاثر" کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔ آپ کی ایک اور اہم کتاب "حکمتِ شرق اور شعراے خمسہ" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں جب حکومت پاکستان نے پیغام اقبالؔ کو عالم عرب میں روشناس کراونے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے نظر انتخاب صاوی شعلان پر پڑی اور یوں آپ مصر سے پاکستان آئے اور کم و بیش ایک سال تک کلام اقبالؔ کے منتخب حصوں کا منظوم عربی ترجمہ کیا۔ اس کام میں ڈاکٹر محمود احمد غازی نے، جو ابھی نوجوان تھے، صاوی شعلانؔ کے معاون کار کے فرائض انجام دیے ۔ ڈاکٹر محمود احمد غازیؔ کے مطابق:

"یہ بات ۱۶/ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی ہے، مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں چھٹی تھی (۱۶/ اکتوبر کو شہادت لیاقت علی خان کی وجہ سے) میں صبح ہی ادارہ تحقیقات اسلامی کی لائبریری میں جہاں Reading Hall تھا وہاں چلا گیا وہاں ایک سرخ و سفید ڈاڑھی والے صاحب

بیٹھے ہوئے تھے۔ جو نفیس لباس اور خوبصورت عمامہ پہنے ہوئے تھے۔ بڑے خوبصورت اور وجیہہ آدمی تھے۔ میں نے سلام کیا۔ قریب جاکر اندازہ ہوا کہ وہ نابینا تھے، بچپن ہی سے مجھے عربی میں بات کرنے کا شوق تھا، جیسے کہ بچوں کو ہوتا ہے۔ سلام و دعا کے بعد عربی میں بات شروع کردی۔ انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ اور ایک آدھ سوال کیا تو میرے لہجے سے خوش ہوئے۔ پوچھا فارسی بھی جانتے ہو؟ میں نے کہا جی... میں فارسی بھی جانتا ہوں۔ کتنی پڑھی ہے؟ میں نے کہا کہ فارسی میں نے کافی پڑھی ہے۔ پوچھا کلامِ اقبالؔ پڑھا ہے؟ تو میں نے کہا کہ بہت پڑھا ہے۔ میں تقریبًا اس دور میں اقبالؔ کا حافظ تھا فارسی اور اردو میں، تو انہوں نے کہا کوئی شعر سناؤ! میں نے فارسی کے دو تین اشعار سنا دیے۔ ان کے سامنے "ارمغانِ حجاز" رکھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آخر میں جو رباعی ہے، اسے پڑھو۔ پہلی رباعی تھی۔ "حرم از دیر دیگر رنگ و بو" کہا اس کا ترجمہ کرو۔ میں نے کردیا بڑے خوش ہوئے۔ ترجمہ ٹھیک تھا، ان کو اچھا لگا۔ انہوں نے بتایا کہ میرا نام شیخ صاوی علی شعلان ہے۔ میں مصر کا مشہور شاعر ہوں اور مجھے حکومت پاکستان نے بلایا ہے کہ میں کلام اقبالؔ کا عربی منظوم ترجمہ کروں، تو کیا تم میرے ساتھ کام کرنے کو تیار ہو؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اس طرح میں مدرسہ چھوڑ کر شیخ شعلانؔ کے ساتھ لگ گیا۔ اور اس طرح منتخب کلام کا ترجمہ ہوا۔ خاص طور پر علامہ اقبالؔ کی فارسی مثنوی کا مکمل عربی ترجمہ ہوا، میں ترجمہ Dictate کردیا کرتا تھا، وہ اپنی برل مشین پر لکھ لیا کرتے تھے اور رات کو کہیں نظم کرتے تھے۔ برل مشین پر وہ نظم اگلے دن صبح Dictate کرواتے، میں اس دوران پھر تیار ترجمہ ان کو نثر میں لکھواتا تھا۔ اس طرح سے کوئی تقریبًا ایک سال میں نے ان کے ساتھ کام کیا۔ اس ایک سال میں تقریبًا جولائی، اگست ۶۹ء تک کافی کام ہوگیا۔"

غازیؔ صاحب کی معاونت سے تکمیل پانے والا یہ کام اس پائے کا تھا کہ بعض مقامات پر ترجمہ اصل سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اسی لیے اہل نظر نے کلام اقبالؔ کے عربی تراجم میں شیخ صاوی علی شعلانؔ کے منظوم ترجمے کو بہترین قرار دیا ہے۔

دوران ترجمہ صاوی شعلانؔ پر کلام اقبالؔ کی معنویت مزید واضح ہوگئی اور یوں انھوں نے

مصر واپسی پر بھی فکر اقبالؔ پر کام کا سلسلہ جاری رکھا اور اس دوران انہیں جامعہ ازہر میں حسن الاعظمیؔ کی معاونت حاصل رہی اور یوں اس مشترکہ کاوش کے نتیجے میں درج ذیل کتابیں منظر عام پر آئیں

(١) فلسفةاقبال

(٢) فلسفةاقبال و الثقافة الاسلاميه فی الهند و باكستان (هندو پاك میں اسلامی تهذیب و ثقافت اور فلسفه اقبال)

(٣) الحیاة و الموة فی فلسفه اقبال (اقبال كا فلسفه حیات و موت)

(٤)حدیث روح(شكوه جواب شكوه كا منظوم ترجمه)

اقبالؔ کے حوالے سے صاوی شعلانؔ کا ایک اور نمایاں کارنامہ ترانہ ملی (چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا) کا منظوم ترجمہ ہے، جسے ''ورلڈ اسلامک لیگ''کا خصوصی نغمہ قرار دیا گیا، اس کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ صاوی شعلانؔ نے اپنی کتاب "العالم الخمسه للشعر الاسلامی''میں عالم اسلام کے پانچ منتخب شعرا فریدالدین عطارؔ، مولانا جلال الدین رومیؔ، مصلح الدین سعدیؔ شیرازی، خواجہ الطاف حسین حالیؔ اور علامہ اقبالؔ کے کلام کا جزوی ترجمہ پیش کیا۔

صاوی شعلانؔ کی ان خدمات کے اعتراف میں انھیں اعلیٰ سرکاری اعزاز سے نوازا گیا۔ صاوی محمد علی شعلانؔ کا انتقال اسّی سال کی عمر میں قاہرہ میں ہوا۔





مہتاب پیامی

ولادت : یکم جولائی ۱۹۷۷ء

والدین: محمد ہارون/مہر النساء

تعلیم: ایم اے (اردو و جغرافیہ)

اساتذۂ ادب : مولانا قرۃ العین فائق مبارکپوری
ڈاکٹر احسان احمد محسن ادیبی، ماسٹر مظہر علی مظہر چشتی
علامہ شارق جمال ناگ پوری، ڈاکٹر شباب الدین صاحب

تصانیف: بت، بت گری اور بت پرستی، قرآن کے سائنسی پہلو
بابائے عربی حسن الاعظمی، اللہ اکبر، رومی کا فلسفہ

PUBLISHER
ALLAMA IQBAL EDUCATIONAL & WELFARE SOCIETY
Mubarakpur, Azamgarh (U.P.)